۸ر جنوری ۱۹۵۲ء کو مجیدیہ کالج الہ آباد میں مولانا حسرت موہانی مرحوم کی یادگار میں یوم حسرت منایا گیا تھا، اس میں اُن کے متعلق جو مضامین اور نظمیں پڑھی گئی تھیں، اُن کو اور اکابر کے بیانات کو کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے، اس مجموعہ میں حسب ذیل مضامین مولانا حسرت موہانی، افقر موہانی، مولانا حسرت موہانی سے میری پہلی ملاقات، عادل رشید صاحب، حسرت سرفراز رسوائی، پروفیسر نجم الدین شکیب حسرت موہانی پروفیسر اختر علی فاروقی، حسرت کی شاعری، پروفیسر مشیر علی صدیقی، حسرت کا عشق اور اس کے ارتقائی مدارج، انجم، اجمل، حسرت کی شاعری پر ایک طائرانہ نظر، نعیم مفتی صدیقی، حسرت اور ان کا عشق، سید محمد عقیل رضوی حسرت کا محبوب سید علی عباس صاحب زیدی تحریک آزادی اور حسرت، پروفیسر مسیح الزمان، حسرت کا ذہنی تجزیہ ڈاکٹر اعجاز حسین، سکون متحرک یعنی حسرت موہانی، مولانا عبد السلام صاحب ندوی، ان مقالات سے حسرت کی سیرت و سوانح اخلاق و کردار، اُن کی سیاسی زندگی، اور شاعری ہر پہلو پر روشنی پڑ جاتی ہے، اور اُن کے اوصاف و کمالات سامنے آجاتے ہیں، اس لحاظ سے یہ مجموعہ قابل قدر ہے، تعلیم گاہوں کے لئے اکابر کی یادگار منانے کا یہ طریقہ مفید اور قابلِ تقلید ہے، اس لئے یادگار کے ساتھ علم و ادب کی بھی خدمت ہو جاتی ہے،

انشاء العربیہ از جناب مولوی ابو الانوار عبد السلام صاحب نعمانی، تقطیع چھوٹی، کاغذ کتابت و طباعت معمولی، قیمت تحریر نہیں، پتہ:۔ مکتبہ ندوۃ المعارف کچی باغ بنارس نمبر ۱،

عربی کے پُرانے طریقہ تعلیم میں دقت بھی زیادہ صرف ہوتا تھا، اور مشکل بھی تھا، اس کو آسان بنانے اور کم مدت میں اس کی تعلیم کے لئے اردو میں عربی کے قواعد کی بہت سی مختصر اور آسان کتابیں لکھی جا چکی ہیں، انشاء العربیہ بھی اسی مقصد سے تالیف کی گئی ہے، اس میں صرف و نحو کے ضروری قواعد کو دلنشیں انداز میں اختصار کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے، اور اُن کی عملی مشقیں بھی دیدی گئی ہیں، اور اُن کی مثالوں میں کثیر الاستعمال الفاظ اور فقروں کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے، جس سے عربی املا و انشاء اور اس کے بولنے میں بھی مدد ملتی ہے، اس لحاظ سے یہ رسالہ عربی تعلیم کے لئے مفید ہے،

"م"

جلد ۷۱ ماہ جمادی الثانی ۱۳۷۲ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۵۳ء عدد ۳

مضامین

شذرات

کوئی سیکولر حکومت کسی فرقہ کی مذہبی تعلیم کا انتظام نہین کرتی، ہر ملک مین مختلف فرقے ہوتے ہین، اس لئے حکومت سبکی تعلیم کا انتظام کر بھی نہین سکتی، چنانچہ انگریزون کے زمانہ مین بھی اس کا انتظام نہین تھا، اس لئے ہندستان کی موجودہ حکومت پر بھی اس کی ذمہ داری نہین ہی، مگر ان دونون حکومتون مین بڑا فرق ہی، انگریزی حکومت عملاً سیکولر تھی، اور اس کا نظامِ تعلیم بھی سیکولر تھا، اس مین کسی مذہب کا کوئی شائبہ نہ تھا اور ہندوستان کی حکومت اگرچہ قانوناً سیکولر ہی مگر ان فرقہ پرستون کے غلبہ اور قوت کی وجہ سے اس کی سیکولرزم کامیاب نہین ہونے پاتی، جن کا مقصد ایسے ملک اور ایسی قوم کی تعمیر ہے، جو اپنی روح کے اعتبار سے خالص ہندو مذہب کا نمونہ ہو، اور یہ نقطۂ نظر ہندوستان کے تمام تعمیری کامون مین نمایان ہی، اس لئے اس کا نظام تعلیم بھی اسی کے مطابق بنایا گیا ہی، اگر یہ تعلیم محض ہندی زبان تک محدود ہوتی تو اس مین کوئی مضائقہ نہ تھا، اب وہ ملک کی قومی زبان بن چکی ہی، جب مسلمانون نے انگریزون کے زمانہ مین ایک اجنبی زبان کو سیکھا تو ان کو ہندی سیکھنے مین کیا عذر ہو سکتا ہی جو ایک ملکی زبان ہی، مگر موجودہ نظام تعلیم کا مقصد تمام فرقون کو ہندو تہذیب کے قالب مین ڈھالنا ہی، چنانچہ پرائمری تعلیم کا نصاب اور اس کا طریقہ تعلیم جو عنقریب جبراً نافذ ہونے والی ہی، تمامتر ہندو کلچر کا ترجمان ہی جس مین اور کسی فرقہ کی تہذیب و روایات کا کوئی نشان نہین ہی،

انگریزون کے زمانہ مین جب حکومت اور تعلیم دونون صحیح معنون مین سیکولر تھین، اُن کو کسی فرقہ سے کوئی تعلق نہ تھا، اور قانوناً اور عملاً تمام فرقون کے حقوق یکسان تھے، مشترک تعلیم خالص غیر مذہبی تھی، اردو اور ہندی کا درجہ تعلیم مین برابر تھا، انگریزون کی تعداد بہت تھوڑی تھی، ہندوستانی عوام سے اُن کا کوئی رابطہ نہ تھا،

اس کے باوجود کوئی فرقہ بھی اُن کے تمدنی اثرات سے بچ نہ سکا، تو ہندوازم کے اس طوفان مین مسلمانون کا جو حشر ہوگا، اس کے اثرات ابھی سے پرائمری اسکولون مین تعلیم پانے والے مسلمان بچون مین مشاہدہ کئے جا سکتے ہین، اگر یہ صورت حال قائم رہی، تو ہماری آیندہ نسلیں اپنے مذہب و اپنی روایات سے بالکل بیگانہ ہو جائین گی، اور تمامتر ہندو تہذیب کے رنگ مین رنگ جائین گی،

اس کے تدارک کی دو ہی صورتین ہین ایک یہ کہ انگریزون کے زمانہ سے مکاتب اسلامیہ کا جو سلسلہ چلا آرہا ہی اور اب بالکل بے جان ہو گیا ہی اس کو محض نام کے لئے نہین بلکہ صحیح معنون مین قائم رکھا جائے، اور صوبۂ بمبئی کی طرح ہندی اسکولون سے الگ اردو کے مستقل اسکول قائم کئے جائین، جن مین مسلمان اپنی تہذیب کے مطابق تعلیم حاصل کر سکیں مگر ہمارے صوبہ کی حکومت کی جو تعلیمی پالیسی ہی اس مین قطعاً اس کا امکان نہین ہی، اور مسلمانون مین قوت سے اس کو منوانے کی سکت باقی نہین ہی، دوسری صورت یہ ہی کہ مسلمان خود اپنے بچون کی ابتدائی تعلیم کا ایسا انتظام کرین، جس سے ان کی مروجہ سرکاری تعلیم مین بھی رکاوٹ نہ ہو اور وہ اردو زبان اور ابتدائی مذہبی تعلیم سے بھی بیگانہ نہ رہین، اگر مسلمان اس کے لئے مستعد ہو جائین تو یہ کوئی دشوار کام نہین ہی، اور ہر ایسے مقام پر جہان مسلمانون کی قابلِ لحاظ آبادی ہو اس طرح کے مکتب قائم کئے جا سکتے ہین، اور مسلمانون کے سرکاری امدادی اسکولون مین تو اس کا انتظام بہت آسان ہی، اس مقصد کے لئے مولینا محفوظ الرحمن صاحب نامی کا سلسلۂ تعلیم قرآن بھی مفید ہی، انھون نے قرآن مجید کی تعلیم کا ایسا سائنٹفک نصاب مرتب کیا ہی جس سے ہر عمر کا آدمی بہت تھوڑی مدت مین، اپنے شوق و طلب کے مطابق عربی زبان، ترجمۂ قرآن اور اسلامی عقائد کی ابتدائی اور متوسط تعلیم حاصل کر سکتا ہی، اور بچون کو چند دنون مین قرآن مجید کے ترجمہ سے مناسبت اور سمجھدار آدمیون میں اسکے ترجمہ کی پوری استعداد پیدا ہو جاتی ہی،

اس وقت مسلمانون کے لئے سب سے اہم مسئلہ اُن کے بچون کی ابتدائی مذہبی تعلیم کا ہی، اگر اسکی جانب توجہ نہ کی گئی تو ہماری آیندہ نسلین محض نام کی مسلمان رہ جائینگی، جنکو اپنے مذہب اپنی تہذیب اور اپنی روایات سے کوئی علاقہ نہ ہوگا، آج ہر مسلمان کو اسکا احساس ہی مگر ان مین قوت عمل نہین ہی، وہ جوش مین آکر ایک مرتبہ پہاڑ سے ٹکرا سکتے ہین، بلکہ جان تک دے سکتے ہین مگر کسی کام کے لئے مسلسل جد و جہد نہین کر سکتے اور اس وقت جوش کے بجائے ہوش و گوش اور خون کے بجائے سعی و عمل اور محنت

دمشقت کا پسینہ بہانے کی ضرورت ہے، قومیں دوسروں کے سہارے نہیں بلکہ اپنے بل بوتے پر زندہ رہتی ہیں، اور جس قوم میں زندگی کا کس بل پیدا ہو جائے، اوس کو کوئی قوت نہ دبا سکتی ہے، اور نہ نظر انداز کر سکتی ہے، محض دوسروں کے شکوہ و شکایت سے کچھ حاصل نہیں ہوتا،

آج بھی ہندوستان میں جمعیۃ العلماء، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور جماعت اسلامی مسلمانوں کے متعدد آل انڈیا ادارے موجود ہیں، اگر یہ سب مل کر اس کام کو انجام دینے کے لئے آمادہ ہو جائیں، تو اس کا ہونا کچھ دشوار نہیں ہے، خصوصاً جمعیۃ العلماء اور جماعت اسلامی کی شاخیں تو ہر جگہ قائم ہیں، اُن کے ذریعہ یہ کام آسانی سے ہو سکتا ہے، یہ وقت اختلاف کا نہیں، اور کم سے کم مشترک معاملات میں مل کر کام کرنے کا ہے، ورنہ اگر مسلمان ہی باقی نہ رہ گئے، تو یہ جماعتیں کس کام آئیں گی، اس لئے ع

گر گر دنی ست چارہ مجنوں کنوں کنید

پاکستان کے قیام کے بعد ہندوستان کے اسلامی ادارے یونہی کیا کم مشکلات میں مبتلا تھے کہ ان دونوں ملکوں کے اختلافات نے ان کی حالت اور زیادہ نازک کر دی ہے، ان اداروں کا ذکر نہیں جو مسلمانوں کی امداد سے چلتے تھے، بلکہ وہ بھی جو کسی کی مدد کے محتاج نہ تھے، موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہو گئے ہیں، دار المصنفین کا دارومدار اسکی مطبوعات کی تجارت پر تھا جس کا زیادہ تر حصہ پاکستان میں ہے، اب اُس نے کتابوں کی تجارت پر ایسی پابندیاں عائد کر دی ہیں کہ مہینوں سے اس کا سلسلہ بند ہے، اگر یہ صورت کچھ دنوں اور قائم رہی تو ان تمام تصنیفی اور اشاعتی اداروں کا چلنا ناممکن ہو جائے گا جن کی کتابیں زیادہ پاکستان جاتی تھیں،

ہندوستان کے مسلمان پاکستان ہی کی بدولت تباہ ہوئے، اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جو نیم جان اسلامی آثار باقی رہ گئے ہیں وہ بھی مٹ جائیں گے، پاکستان میں ہندوؤں کے اتنے آثار و باقیات نہیں ہیں، جتنے ہندوستان میں مسلمانوں کے ہیں بلکہ ان کا سب کچھ تو یہیں چھوٹ گیا ہے، جا کر وہ مسلمان ہی موجود ہیں اس لئے ایسے اختلافی معاملات کو سلجھانے کی ذمہ داری جن کا اثر ان آثار کی موت و حیات پر پڑے پاکستان پر زیادہ عائد ہوتی ہے اس لئے اس کو جلد سے جلد اس صورت حال کو ختم کرنے کی کوشش کرنا چاہئے،

مقالات

قرآن کے صابئین

کیا

بدھ مذہب کے ماننے والے تھے؟

از مولانا سید مناظر احسن گیلانی

(۲)

بدھ مت پر بعد کو جو کچھ گذری وہ میری بحث کا موضوع نہیں ہے، بلکہ کہنا یہ ہے کہ بودھا یا بوذاسف کے ماننے والوں کو صابئہ کہتے تھے، اس کا ذکر المسعودی نے علاوہ مذکورۂ بالا مقام کے اسی کتاب میں دوسری جگہ ان الفاظ میں کیا ہے :-

ابوذاسف احدث مذاهب الصابئة، (مروج ص ۷، جلد ۲ بر کامل)	صابئہ کے مذاہب یعنی دینی خیالات کو ابوذاسف ہی نے پیدا کیا،

اور المسعودی تو خیر ہندوستان کا صرف سیاح ہے، یہاں کی علمی زبانوں یعنی سنسکرت یا پالی وغیرہ سے بھی آشنا تھا، مجھے اس کا علم نہیں ہے، لیکن ابو ریحان بیرونی کو کون نہیں جانتا کہ ہندی زبانوں اور ہندی علوم و معارف کا اپنے وقت ہی میں نہیں، بلکہ شاید آج تک مستند ترین ماہر مانا جاتا ہے، اپنی مشہور کتاب الآثار الباقیہ میں اُس نے جو کچھ لکھا ہے، میں بجنسہ اس کے الفاظ نقل کر دیتا ہوں :-

بوذاسف قد ظهر عند مضی
سنة من ملك طهمورث
بارض الهند واتی بالکتابة
الفارسیة ودعا الی ملة الصابئین
فاتبعه خلق کثیر وبقایاهم
الآن بالهند والصین والتغزغز
یسمیهم اهل خراسان شمنان
وآثارهم وبهارات اصنامهم
وفرخاراتهم ظاهرة فی الثغور
خراسان المتصلة بالهند
(مطبوعہ جرمنی ص۲۰۶)

بوذاسف (یعنی بودھا) شاہ طہمورث (ایرانی) کے ایک سال بعد سرزمین ہند مین ظاہر ہوا، اور فارسی حروف کو اس نے رواج دیا، اسی نے الصابئین کی ملت کی طرف لوگون کو دعوت دی، بہت بڑی خلقت اس کی پیرو ہوگئی، جن کے بقایا (نام لیوا) آج تک ہندوستان اور چین، تغزغز (ترکی قبائل) مین پائے جاتے ہین، ان کو خراسان کے لوگ ان کو "شمنان" کہتے ہین (بوذاسف کے ان ماننے والون) کے آثار اور اُن کی مورتیون، اور فرخارات (یعنی پیکرون) کے بہارات خراسان کے ان حصون مین جو ہندوستان سے متصل ہین، عام طور پر پائے جاتے ہین،

البیرونی نے جس تفصیل سے کام لیا ہے اُس کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم قطعی طور پر اسی نتیجہ تک پہنچے ہین کہ الصابئین کی ملت کا داعی البیرونی کے نزدیک بھی بوذاسف یعنی بدھا تھا، بہارات کا لفظ بہار کے لفظ کی جمع ہے، اور یہ معلوم ہے کہ بودھ مذہب کے دینی مراکز کی تعبیر بہار سے کی جاتی تھی، بہار کے صوبہ مین بودھ مذہب کے دینی مرکزون کی کثرت تھی، اس لئے اس صوبہ کا نام ہی بہار ہوگیا، بلکہ جاننے والے جانتے ہین کہ وسط ایشیا کا شہر بخارا دراصل بہار ہی کے لفظ کی ایک شکل ہے، ایک زمانہ مین خراسان کا یہی شہر بودھون کا

مرکز تھا، بلخ کا نوبہار تو مسلمانون کی آمد تک موجود تھا، عباسی دربار کے برمکی وزرا، کا نسبی تعلق بلخ ہی کے اسی نوبہار کے پرمکھون سے تھا، پرمکھ کا لفظ عربی مین برمک بن گیا،

اصنام کے ساتھ فرخارات کا لفظ ظاہر ہے کہ فارسی کے لفظ "پیکر" کی عربی شکل ہے، باقی البیرونی کی یہ اطلاع کہ بوذاسف نے فارسی کتابت کے طریقہ کو اختیار کیا، چونکہ قدیم ایرانی حروف سے بھی مین ناواقف ہون، اور پالی زبان کے حروف سے بھی ناآشنا ہون، اس لئے نہین کہہ سکتا کہ البیرونی کا صحیح مطلب کیا ہے؟[1]

عام طور پر ہماری پرانی کتابون مین "شمنیہ" کا لفظ مستعمل ہے، جس کے متعلق یہ سمجھا دیا جاتا ہے کہ وہ ہندوستانی متفکرین کے کسی خاص گروہ کی تعبیر ہے، لیکن البیرونی کے اس بیان سے کہ خراسان مین بودھسٹون کو یعنی بوذاسف کے پیروؤن کو "شمنان" کہتے تھے، اب یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ "شمنیہ" اسی "شمنان" کی نسبت سے بنا لیا گیا تھا، جس سے مراد بدھمتی کے لوگ تھے، اور بھی بہت سے جدید اکتشافات بیرونی کی اس اطلاع سے حاصل ہوتے ہین، جس کی تفصیل کا یہان موقع نہین ہے، میری غرض صرف یہ ہے کہ "الصابئین" بودھا کے ماننے والون کا نام ہے، المسعودی کے سوا ابوریحان بیرونی جیسے ماہر ہندیات کی علمی شہادت بھی یہی ہے،

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مورخین کی یہ تاریخی تحقیق کہ "الصابئہ" جن کا قرآن مین یہود ونصاریٰ جیسی عالمگیر امتون کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، یہ مہاتما بدھ کے ماننے والے بودھسٹون کی تعبیر ہے جو دینی علوم کی خدمت کرنے والے علما، اور مفسرین تک شاید نہ پہونچ سکی، اور عراق کے آجام و بطائح مین جو صابی بھی پائے جاتے تھے، انہی کے متعلق جو تھوڑے بہت معلومات ان تک مختلف ذرائع سے پہنچتے رہے، ان ہی پر

---

[1] مولانا عنایت رسول چریاکوٹی مرحوم کا حال ان کی کتاب (بشریٰ نامی) کے شروع مین جو درج ہے، اس میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ فارسی کا قدیم رسم خط بائین طرف سے لکھا جاتا ہے، جس زبان مین ژند اوستا زرتشتی دین کی کتاب ہین (ص۲) پر بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ سنسکرت کے رسم خط کی جگہ مہاتما بدھ نے غالباً سہولت کی وجہ سے انہی قدیم ایرانی حروف کے رسم خط کو اختیار کر لیا تھا، وہی پالی کے نام سے مشہور ہوا، ہندوستان مین پالی

ہمارے بزرگون نے قناعت کر لی، لیکن دینی علماء کے سوا ہمارے ایران تعلیم یافتہ متفکرین کا جو طبقہ تھا وہ اسلامی مورخین کی مذکورۂ بالا تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ واقف تھا، اور مسلمانون مین فلسفہ کی جو شاخ اشراقی فلسفہ کے نام سے موسوم ہے، اسی فلسفہ کی کتاب شرح حکمۃ الاشراق مین بوذاسف یعنی بودھا کے متعلق لکھا ہے کہ

هُوَ الَّذِي شرع دين الصّائبة — بوذاسف وہی ہے جس نے صابئہ کے دین کو جاری کیا،

(شرح حکمۃ الاشراق ص ۴۷۹)

اگرچہ اسی کے ساتھ ایک ایسا قول بھی اسی کتاب مین درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عراقی صابئون کو دیکھ کر بعض لوگ بوذاسف یعنی بودھا کے متعلق اس مغالطہ مین مبتلا ہو گئے کہ وہ ہندوستان کا نہین بلکہ کالڈیا کا رہنے والا تھا، اور کالڈیا والے جو کسدانیون کے نام سے بھی موسوم تھے، ان کی ستارہ پرستی وغیرہ کے طریقہ کا موجد وہی تھا، اسی نے تاریخ کے سنین متعین کئے، اور دنیا کو مختلف ادوار مین تقسیم کیا[۱]

غرض جس طرح عراقی صابیون کی وجہ سے ہمارے مفسرین "الصابئین" سے بوذاسف کے رشتہ کا پتہ نہ چلا سکے، اسی طرح عراق کے ان ہی صابیون کو دیکھ کر اور یہ معلوم کر کے کہ "الصابئین" بوذاسف کے پیرون کا نام ہے، ہمارے ارباب فکر و نظر کا ایک گروہ اس مغالطہ کا شکار ہو گیا کہ بودھا ہندوستان مین نہین بلکہ عراق ہی مین پیدا ہوا تھا، اور وہین اپنے دین کو اس نے جاری کیا، اور اسی قسم کے دوسرے مسائل بھی

(بقیہ حاشیہ ص ۱۶۷) جاننے والے علماء پیدا ہو چکے ہین، وہی بتا سکتے ہین کہ اصل واقعہ کیا ہے، [۱] دیکھیے شرح حکمۃ الاشراق ص ۹، نہ مطبوعہ ایران، دلچسپ بات اسی سلسلہ کی یہ ہے کہ نوح علیہ السلام اور ان کے مشہور طوفان سے پہلے تسلیم کر لیا گیا تھا کہ بودھا قدیم بابل مین پیدا ہو چکا تھا، اور یہ کہ اپنے نجومی حساب سے اس نے اس طوفان کی پیشین گوئی بھی کی تھی، اپنے ماننے والون کو پہلے ہی سے ہشیار کر دیا تھا،"

عراقی صابیوں کے خاص حالات نے پیدا کر دیئے تھے، جن کی تفصیل کی اس مختصر مقالہ مین گنجائش نہین، تو یہان آخر مین قابلِ ذکر اور لائقِ توجہ یہ سوال رہجاتا ہے کہ الصابئین اگر بدھا تمابدھ کے ماننے والون کی تعبیر ہے تو یہ سوال ہو سکتا ہے کہ نبوت کے مانے والون کے "الصابئین" کے نام سے موسوم ہونے کی وجہ کیا تھی، اور عرب و اطرافِ عرب مین اس نام سے وہ کیون مشہور ہوئے، اور یہ کہ اہلِ مکہ "اسلامی دین" کے قبول کرنے والون، بلکہ خود داعی اسلام علیہ السلام پر یہودی عیسائی یا مجوسی ہو جانے کے صابی ہو جانے کا الزام کیون لگاتے تھے،

برسون سے اس مسئلہ پر غور و فکر کرنے کے باوجود مین کسی اطمینان بخش نتیجے تک نہین پہونچ سکا ہون، سمجھ مین نہین آتا، کہ اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ جن سے عرب اچھی طرح واقف تھے، اور جن کی کافی تعداد عرب مین پائی جاتی تھی، اسلام جو اس کا مدعی ہے کہ سارے مذاہب و ادیان جو خدا کی طرف سے بنی آدم کو عطا ہوئے، قرآن ان خدائی "قانونون اور قدرتی آئین کی آخری شکل ہے، ان ساری آسمانی کتابون کا آخری اڈیشن ہے، اسی نے مطالبہ کیا گیا ہے کہ جس کسی کے پاس بھی دین یا مذہب جس شکل مین بھی اپنے باپ دادون سے پہنچا ہو، اس کا فرض ہے کہ آسمانی کتاب کے اسی آخری اڈیشن سے اس کی تصحیح کرے،

ان مذاہب و ادیان کے جن عناصر و اجزاء پر قرآن نے توثیق و تصدیق مہر ثبت کر دی ہے سمجھنا چاہیئے کہ بنی آدم کے قدرتی آئین کے وہی صحیح اجزاء ہین، ان کے سوا جو کچھ بھی جس دین مین ملے، اسے قلم زد کر دینا چاہیے

---

[۱] مثلاً معلوم ہوتا ہے کہ ان عراقی صابیون یا شام کے صحرائی علاقون حران وغیرہ مین جو صابی پائے جاتے تھے ان مین بعضون نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا، مگر باوجود اس کے یہ صابی بھی کہلاتے تھے، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف یہ فتویٰ منسوب کیا گیا ہے کہ اہلِ کتاب کا دین جن صابیون نے اختیار کر لیا ہے، ان کے ساتھ اہلِ کتاب کا برتاؤ کرنا چاہیئے یعنی اُن کی عورتون سے ازدواجی رشتہ بھی مسلمان قائم کر سکتے ہین، اور ان کا ذبیحہ بھی کھا سکتے ہین،

(دیکھو تفسیر جصاص اور فقہ کی دوسری کتابین)

اس لحاظ سے سب سے زیادہ تصدیقی تعلق قرآن کا اہل کتاب یعنی یہود و نصاری ہی کے دین سے تھا، اسلئے سوال یہ ہوتا ہے کہ اپنے انکار و کفر کی توجیہ اور عذر تراشی کے لئے عربون کے لئے یہ زیادہ آسان تھا کہ وہ قرآنی تعلیمات پر یہ الزام لگا دیتے کہ وہ اہل کتاب یعنی یہود و نصاری کے دین سے ماخوذ ہین جیسا کہ آج تک یہ جھوٹا الزام یورپ کے منکرون کی بڑی تعداد کی پناہ گاہ بنا ہوا ہے،

لیکن اس کے بجائے اسلامی دین کے قبول کرنے والون، بلکہ خود داعی اسلام علیہ السلام پر صابی ہوجانے کا الزام قریش مکہ کیون لگاتے تھے، جیسا کہ یورپ کے بعض مستشرقین مثلاً ڈوزی نے لکھا ہے کہ

"ہندوستان سے بدھ مت کے مبلغون کی ایک جماعت جہان سیلون، برہما، چین گئی، اسی طرح ایران، اور مشرق قریب مین بھی اس مذہب کے منادی تبلیغی جد و جہد مین اسلام سے پہلے مشغول تھے (ڈوزی کے مقالات کا عربی ترجمہ)

اگر اس کو مان لیا جائے تو ظہور اسلام سے پہلے مشرق قریب مین جس مین عرب بھی شریک رہے، بدھ مت کے مبلغون کی تبلیغی جد و جہد کا دعویٰ ڈوزی صاحب کی کوئی دماغی اختراع ہے، یا واقعی تاریخی وثائق کی روشنی مین وہ اس نتیجہ تک پہنچے ہین،

کچھ بھی ہو اگر ہم ان کے اس تاریخی اکتشاف کو تسلیم بھی کر لین، اور جیسا کہ عام طور پر اس زمانہ مین کہا جاتا ہے کہ بودھ مذہب کے لٹریچر کی تلاش و تحقیق سے لوگ اس نتیجے سے پہونچے ہین کہ مہاتما بدھ کا دعوی تھا کہ جس دھرم کو وہ پیش کر رہے ہین،

"یہ وسطی (درمیانی) راستہ ہے یعنی نہ تو عیش و عشرت مین مخمور رہنا چاہئے اور نہ فاقہ کشی شب بیداری اور دشوار عملیات سے روح کو ایذا پہونچانا چاہئے[1] بلکہ ان دونون کے بیچ مین رہنا لازم ہے" (ص (قرون وسطی مین ہندستانی تہذیب)

[1] واقعہ یہ ہے جیسا کہ جاننے والے جانتے ہین کہ ساکیہ منی مہاتما بدھ کے زمانہ مین اور اس سے پہلے ہمارے ملک

اسی طرح پتہ چلایا گیا کہ بدھ کی تلقین یہ تھی کہ

"دنیا اور اس کی سب ہی چیزین فانی، اور غم انگیز ہین" (قرون وسطی مین ہندوستانی تہذیب)

پس ایسی زندگی کو جو فانی نہیں، بلکہ باقی ہو اور غم و اندوہ کی آلایشون سے پاک ہو کر صرف سکھ ہی سکھ بن جائے، جو حاصل کرنا چاہتا ہے، اس کو "نروان" کے شرائط کی تکمیل کرنا چاہئے، کرنل السکاٹ نے تھیاسوفیکل سوسائٹی مین جو لکچر "بدھ دھرم" پر ۱۸۸۳ء مین دیا تھا، اس مین اس کا اقرار کیا تھا کہ

"بودھ دھرم مردہ ہو چکا تھا" (ص ۲۵)

مگر اسی مردہ دھرم کی دفن شدہ ہڈیون کو الٹنے پلٹنے کے بعد ان پر ثابت ہوا تھا کہ منجملہ دوسری باتون کے "نروان" کے لئے مہاتما بدھ کی طرف سے یہ مطالبہ پیش ہوا تھا کہ

بقیہ حاشیہ ص ۱۷۰) ہندوستان مین مقاصد و اغراض کو حاصل کرنے کے لئے "نروان" کا طریقہ عام طور پر مقبول تھا، یعنی دیوتا اور معبود کے سامنے اپنے آپ کو دکھ پہونچایا جائے، جیسے وہ فقیر جو کوڑے مار کر اور اپنے بدن سے خون نکال نکالکر پھینکدینے پر لوگوں کو مجبور کرتے ہیں، اس راہ مین لوگ اپنے بدن کا گوشت تک۔ کاٹا کرتے تھے، راون کا قصہ مشہور ہے کہ دس سرون میں سے اپنے نو سر کاٹ کاٹ کر آگ میں جھونکتا رہا، جس کے بعد "نروان" اس کو ملا، نروان کی قوت سے بالآخر وہ فرعون بن گیا، عام طور پر ہندی قصص "نروان" کے ذکر سے معمور ہین، آج کل عوام اسی کو "تپ دان" کہتے ہین، اسی کا نتیجہ تھا کہ لوگ پہاڑون سے اپنے آپ کو گراتے تھے، آہنی سیخون پر گر گر سارے بدن کو لہولہان کرتے تھے، ہندوستان کے جنگل "نروان" کے طالبوں سے کسی زمانہ مین بھرے رہتے تھے، جس دکھ اور مصیبت کی زندگی وہ گذارتے تھے، آج ہم اس کا تصور بھی نہین کر سکتے، کہتے ہین کہ ساکیہ منی مہاتما بدھ بھی کچھ دن تک اسی "نروان" کے چکر مین گھومتے پھرے، اور بالآخر ان پر بجائے "نروان" کے "نروان" کا اصول واضح ہوا، جس مین نجات کے لئے خواہ مخواہ کی غیر فطری مصیبتون کی برداشت کرنے کا انکار کیا گیا اور مذہبی مطالبات کے مطابق پاکیزہ اخلاقی زندگی کو نروان یعنی نجات کے لئے کافی قرار دیا گیا،

"قتل مت کرو، چوری مت کرو، ممنوعہ لذات سے پرہیز کرو، جھوٹ مت بولو، نشہ یا مست کرنے والے عرق یا اشیا کا استعمال مت کرو"[1] (ص ۳۸)

اگر فلسفیانہ موشگافیوں اور منطقیانہ احتمال آفرینیوں کے انبار کے نیچے سے ڈھونڈھنے والوں کو بدھ دھرم میں درحقیقت یہ چیزیں ملی ہیں، تو اسلام کی تصدیقی و توثیقی فہرست میں بدھ مذہب کے بھی بعض اجزا شریک ہو جاتے ہیں، اور دونوں میں مشابہت و مناسبت کا مسئلہ چندان بعید از قیاس باقی نہیں رہتا،

بلکہ ہمارے بعض علما کے اس دعویٰ کا کہ "تناسخ" کا عقیدہ جن مختلف مذاہب میں پایا جاتا ہے ان میں ایک بوذاسف الہندی کا دین بھی ہے، واقعی مطلب یہ تھا کہ

عرضهم هو اثبات المعاد الجسمانی فی النشاءة الاخرة علی وجه مفصل (تعلیقات شرح حکمة الاشراق ص ۴۴۹)

آخرت کی دوسری زندگی میں جسمانی طور پر واپسی ہوگی، اسی عقیدے کی تفصیل کا نام تناسخ ہے،

اس سے ان لوگوں کا مطلب یہ ہے کہ مذاہب و ادیان کی باتوں میں فلسفہ کا رنگ بھر کر روحانی حشر و نشر کا جو عقیدہ پھیلا دیا گیا تھا، اور جس کا کوئی صحیح مطلب ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتا، جو جسم اور بدن کے بغیر سکھ یا دکھ کے احساس کا تخیل بھی نہیں کر سکتے تھے، اسی لئے "روحانی معاد" کا مجہول نظریہ عموماً انکار آخرت کے ہم معنی بن جاتا تھا، اس خیال کی تردید اور اسی مغالطہ کے ازالہ کے لئے یہ سمجھا گیا تھا کہ آیندہ زندگی میں جسمانی قالب ہی کے ساتھ لوگ اٹھیں گے، نیک کرداروں کو حسین و جمیل جسمانی قالب عطا ہوگا، اور

[1] کرنل اسکاٹ نے یہ بھی لکھا ہے کہ بدھ متی کے تمام فرقوں کا ان باتوں پر اتفاق تھا اور برہما، چین، جاپان و [illegible] میں کرنل صاحب کے زمانہ میں بدھ متی کے جو مستند علما تھے، ان کے دستخط بھی ان اتفاقی امور پر حاصل کئے گئے تھے (دکھو ان کا لکچر ص ۳۸ و ۳۹)

بدکرداروں کو اُن کے بُرے اعمال کے مطابق بری صورتوں اور مسخ شدہ قالب میں زندہ کیا جائیگا،

بہرحال "تناسخ" کے جس عقیدہ کو مہاتما بدھ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، اس کا مطلب یہی ہے کہ دوسری زندگی بھی جسمانی قالب میں نمایاں ہوگی، اور "پنرجنم" یا آواگون کا دھرم جو بدھ مذہب کے فلسفی مزاج شارحین کی اختراع ہے، جس کا اضافہ بعد کو اس مذہب کے عقائد میں ہوا، واقعہ کی نوعیت اگر یہی ہے، تو آخرت کے اس عقیدے اور اسلام کے اخروی زندگی کے عقیدہ میں فرق ہی کیا رہ جاتا ہے، اور جیسا کہ حدیثوں میں آیا ہے کہ جنت میں لوگ جرد مرد یعنی صاف ستھرے چہروں کے ساتھ داخل ہوں گے، اور جہنم میں ایک ابوجہل ہی ایسے طویل و عریض بدن کے ساتھ داخل ہوگا کہ اس کا ایک ایک دانت احد پہاڑ کے برابر ہوگا، اُن کا مطلب یہی تو ہے کہ ایک اچھے قالب میں اچھے لوگ اور بُرے قالب میں بُرے لوگ آیندہ زندگی میں اٹھیں گے،

کچھ بھی ہو فلسفیانہ نکتہ نوازیوں اور خرافاتی توجیہوں، تحریفی تاویلوں کے نیچے دفن شدہ بودھ دھرم میں کریدنے والوں کو آج جو کچھ بھی مل رہا ہو، مگر ہم جب یہ جانتے ہیں کہ بدھ کے مرنے کے چند صدیوں بعد ہی بودھ کی صحیح تعلیم مختلف فرقوں کی من مانی تشریحات کی شکار ہو کر نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی، اسی مضمون میں گذر چکا ہے کہ بدھ متی میں مورتی پوجا کا رواج ہو گیا تھا، اور کیسا رواج؟ کہ ہندوستان کا چپہ چپہ بدھ مورتیوں سے گویا پٹا ہوا تھا، اور تو اور خود غریب بدھ ہی کی مورتی بنا بنا کر لوگ پوجنے لگے تھے، کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ فارسی کے لفظ "بُت" کی اصل "بدھ" ہی تھی، دال "ت" سے بدل گئی، چینی سیاح اتسنگ نے لکھا ہے کہ جب وہ ہندوستان آیا تھا، اس زمانے تک

"بودھ دھرم میں اٹھارہ فرقے ہو چکے تھے" (قرون وسطی ص ۴)

ان میں دو فرقوں میں "ہین یان" "مہایان" کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی،

اگر یہ مان لیا جائے کہ مشرق قریب میں بدھ مت کی اشاعت کا ڈوزی کا دعویٰ صحیح تاریخی شہادتوں پر مبنی ہے، تو ہو سکتا ہے کہ بدھ مت مذہب کے داعی بت متی کے نام سے جس دین کو پیش کر رہے تھے، وہ مہاتما

کی تعلیمات کے صحیح اجزاء کا ترجمان رہا ہو، اور اسی کو دیکھ کر مکہ والون نے مسلمانون کو صابی کہنا شروع کیا تھا، مگر بظاہر جو واقعات ہم تک پہنچے ہین ان سے اس کی تائید نہین ہوتی، ہمارے یہان کی روایتون مین صرف ایک روایت جو مشہور تابعی قتادہ کی طرف منسوب کی گئی ہے، اور جس کی رو سے "صابئین" کی دوسری خصوصیتون مین ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ

یصلون الی الشمس کل یوم خمس صلوت (رازی ج ۲ ص ۴۱۹) — وہ آفتاب کی طرف رُخ کرکے دن بھر مین پانچ دفعہ نمازین ادا کرتے ہین،

اس سلسلہ میں بس یہی ایک روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام مین جیسے پانچ وقتون مین نمازین پڑھی جاتی ہین، اسی طرح صابیون کے یہان بھی پانچ ہی اوقات عبادت کے تھے، لیکن اسی روایت مین یہ بھی ہے کہ صابی آفتاب کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھتے تھے، ایسی صورت مین محض عبادت کے پانچ اوقات کا اشتراک اہلِ مکہ کے مسلمانون کو صابی کہنے کے لئے کافی نہین ہوسکتا، سچ تو یہ ہے کہ بدھ بیچارے کی طرف اس زمانہ مین یہ عقیدہ تک منسوب کیا جا رہا ہے کہ وہ سرے سے خدا ہی کا قائل نہ تھا، یا قائل بھی تھا تو اس کے نزدیک خدا اور انسانی روح بلکہ کیڑون مکوڑون کی جان مین کسی قسم کا فرق نہ تھا، ونسنٹ صاحب اپنی تاریخ قدیم ہند مین لکھتے ہین کہ بدھ کا عقیدہ تھا کہ

"وہ ہستی جو اس وقت آسمان مین دیوتا کی حیثیت رکھتی ہے، ممکن ہے مرورِ ایام کے دوران مین بالآخر ایک کیڑے مکوڑے کی شکل مین دنیا مین نمودار ہو، اور بجنسہ اسی طرح ایک کیڑے کے لئے ممکن ہے کہ وہ بتدریج دیوتا کا درجہ حاصل کرے" (ص ۱۷۲)

جہان دین کو فلسفہ کی ان بھول بھلیون مین داخل کرکے معادِ جسمانی یا تناسخ کے چکر مین اتنی وسعت پیدا کر دی گئی ہو کہ آسمانون والا دیوتا، یا خدا بھی اس چکر سے (العیاذ باللہ) آزاد نہین ہے، تو ایسا دین دین ہی کب باقی رہتا ہے اور اسلام جیسے سیدھے سادے دین کے ساتھ اس کی مشابہت و مناسبت کی صورت ہی

کیا رہ جاتی ہے، اسی لئے مین نے عرض کیا تھا کہ مسلمانون کو مکہ والون کے یہودی یا عیسائی کہنے کے بجائے صابی کہنے کی کوئی صحیح توجیہ اب تک میری سمجھ مین نہین آئی ہے.

اسی طرح اس کا جواب بھی مشکل ہے کہ عرب اور اس کے علاقون مین بدھ مذہب کے پیرودن کو لوگ "صابئین" یا "صابئہ" کیون کہنے لگے تھے، ممکن ہے اس علاقے میں بدھ مت جن لوگون کے ذریعہ پہنچا ہو، ان مین سے کسی شخص یا فرقہ کے نام کی طرف منسوب ہوکر یہ لفظ بنا ہو،

لیکن بقول ونسنٹ صاحب جب حال یہ ہے کہ

"بدقسمتی سے بدھ مذہب کی ان تبلیغی مشنون کا حال محفوظ نہین، جو ایشیا، افریقہ اور یورپ کی یونانی سلطنتون مین بھیجے گئے، اور نہ ان مبلغون کے نام ہی ہم کو معلوم ہین"

(تاریخ قدیم ہند ص ۱۷۶)

تو اس احتمال کو بھی پیدا کرکے ہم کسی صحیح نتیجہ تک نہین پہنچ سکتے، یہ صحیح ہے جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے، کہ خود ہم مسلمانون کو مختلف ملکون، علاقون مین مختلف نامون سے لوگ موسوم کرتے رہے ہین، یورپ والے ہمین سارا سین یا مور کہتے ہین، ہندوستان پہنچ کر ہم ترک کے نام سے یاد کئے گئے، چین مین سنتے ہین کہ مسلمانون کو "ہوئی ہوئی" کہتے ہین، ممکن ہے کہ کچھ اسی قسم کی صورت بدھ مذہب کے ماننے والون کے ساتھ بھی پیش آئی ہو، ابوریحان بیرونی کا بیان آپ پڑھ چکے کہ خراسان مین لوگ ان کو شمنان کہتے تھے، مگر ان الفاظ کی تو کچھ نہ کچھ توجیہ ہم کر سکتے ہین، لیکن صابی، صابئین یا صابئہ کے نام سے بدھ کے ماننے والون

لے یورپ والے کہتے ہیں کہ سارا سین اصل صحرا نشین یا سارقین (چور) ہو، لیکن درحقیقت یہ لفظ سارا قین تھا، عرب والے، اسمٰعیل بن ابراہیم علیہ السلام کی اولاد شمار ہوتے تھے، یہود کا دعویٰ تھا کہ اسماعیل علیہ السلام کی والدہ ہاجرہ ابراہیم علیہ السلام کی دوسری بیوی سارہ کی لونڈی تھین، اس لئے سارے عرب کو وہ سارا قین (سارہ کے غلام) کہتے تھے، حالانکہ حضرت ہاجرہ شاہِ مصر کی صاحبزادی تھیں، مسلمانون کو ہندوستان مین ترک اس وجہ سے کہنے لگے کہ زیادہ تر اسلام اس ملک

کو موسوم کرینگی ایسی توجیہ جو دلنشین ہو اب تک سمجھ مین نہین آئی یون کہنے کیلئے تو مختلف احتمالات پیش کئے جا سکتے ہین مثلاً خود

مہاتما بدھ کا اصلی نام کہا جاتا ہو کہ سدھارتھ تھا، بدھ مذہب کے فقیرون کو بھی سادھو کہتے تھے، بدھ متی والون مین

بعد مین جن مورتیوں کی پوجا کا رواج ہوا، ان کو بھی "بودھی ستودن" کے نام سے موسوم کرتے تھے، سمادھی

بدھ مذہب والون کے مذہبی استغراق کی تعبیر تھی، سوبھدرا مہاتما بدھ کے چیلون مین ایک مشہور شخصیت کا نام

تھا، ان سارے الفاظ کے شروع مین س کا حرف پایا جاتا ہے، جو بآسانی عربی کے ص کا تلفظ اختیار کر سکتا ہے،

اسی طرح ہندی کے "دھ" کا تلفظ جو لوگ ادا نہین کر سکتے، ان کی زبان مین مختلف شکلیں اختیار

کر سکتا ہے، اور ایک زبان کے الفاظ کے دوسری زبان مین منتقل ہونے مین اس قسم کی تبدیلی کوئی عجیب

نہین ہو اور برابر ہوتی رہتی ہے،

آخر بودھا کا لفظ جب "بوذاسف" بن سکتا ہے، تو کیون نہ سمجھا جائے کہ صابی کا لفظ بھی کچھ اسی قسم

کے الٹ پھیر ردوبدل کے تصون سے متاثر ہوا، طبقات الاطبا، مین عراقی صابیوں کی اصل بتاتے ہوئے

ابن ابی اصیبعہ نے جو کچھ لکھا ہو اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے یعنی جن کو لوگ صاب کہتے تھے، وہ حضرت ادریسؑ کے

کے صاجزادے طاط کی نسل مین ہین (ج ۲ ص ۲۰۵ طبقات الاطبا،)

اگر یہ مان لیا جائے کہ طاط کو ادریس علیہ السلام کا صاحبزادہ قرار دینا کسی غلط فہمی یا اسمی اشتباہ پر

مبنی ہے، تو دھیان کچھ ادھر جاتا ہے کہ مشرق قریب یا عرب اور اس کے نواح مین شاید صاب ضابی

(بقیہ حاشیہ ص ۵،۱) میں ترکی ذہین کے ساتھ ہی پہنچا تھا، مور کا لفظ ممکن ہے مراکش وغیرہ کی طرف منسوب ہو،

ہوتی ہوئی" کی توجیہ بھی کسی نے کی تھی، جواب یاد نہیں، باقی بدھسٹون کو شمنان کہنے کی یہ ط ہر وجہ

یہی معلوم ہوتی ہے کہ سومنات کی طرف خراسان والے ان کو منسوب کرتے تھے،

ملہ اسی سے اندازہ کیجئے کہ ملتان جب کہ مسلمان پہونچے تو وہان کی سب سے بڑی مورتی کے متعلق ان مین یہ خیال

پھیل گیا کہ ان صنمہ ھُوا یوب النبی علیہ السلام (ص ۲۰۵، کامل ابن اثیر یعنی یہ مورتی ایوب علیہ السلام

مذہب کے داعی کی تعبیر تھی، یعنی پہلا آدمی اس علاقہ مین جو پہنچا، ممکن ہے اس کا اصلی نام طاط یا تاٹ ہو،

اور صاب اس کا دینی لقب[له] ہو، اور اسی کی طرف منسوب ہو کر اس کے ماننے والے "صابئین" کے نام

سے موسوم ہوے ہون واللہ اعلم بالصواب،

(بقیہ حاشیہ ص ۶،۱) پیغمبر کی ہے، بظاہر یہ خیال گذرتا ہے کہ ملتان میں پرہلاد کا مشہور مندر تھا، اور جیسا نہ

اس سلسلہ میں اب تک بیان کیا جاتا ہے، اس مین پرہلاد کے باپ کا نام کشیپ بتایا گیا ہے، اکش یپو ہی کا لفظ ممکن ہے

عربون کے کان مین یا ان کی زبان پر "ایوب" بن گیا ہو، ورنہ ملتان سے حضرت ایوب علیہ السلام کا بھلا کیا تعلق، تاریخ

مین اس قسم کے عجائبات کی کمی نہین ہے، ملہ راہ صواب پر چلنے والا یا راہ صواب بتانے والا، اس مفہوم کی گنجائش

"صاب" کے لقب امیں پیدا ہوتی ہے، ممکن ہے کہ واقعہ کی کچھ صورت یہی ہو،

امام غزالی

کی

غیر مستند تصانیف

از

پروفیسر مسعود حسن صاحب ایم اے سنٹرل کالج کلکتہ

مسلمان مصنفین میں ابن جریر طبری اور ابن حزم ظاہری کے بعد امام غزالیؒ کا تحریری سرمایہ غالباً سب سے زیادہ ہے، مگر افسوس ہے کہ اس کا ایک معتد بہ حصہ ان کی طرف غلط طور پر منسوب ہوگیا ہے، جس سے نہ صرف امام موصوف کے متعلق طرح طرح کی غلط فہمیان پیدا ہوگئی ہین بلکہ ان کے ذاتی خیالات اور عقائد تک پہنچنا بہت مشکل ہوگیا ہے، ضرورت ہے کہ علمی تحقیقات کے ذریعہ ان کی تمام اصلی تصنیفات کا سراغ لگایا جائے،

غزالی کی جعلی تصانیف کا ذکر آج سے بہت پہلے علامہ ابن السبکی، محی الدین بن العربی، ابن الصلاح، حاجی خلیفہ صاحب کشف الظنون اور علامہ مرتضیٰ حسینی شارح احیاء العلوم اپنی تحریرون مین کرچکے ہین، خود علامہ شبلی نے الغزالی مین ایک مستقل عنوان کے ماتحت اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے[1]، اس لئے یہ کوئی نئی بحث نہیں ہے، مگر زیر نظر مقالے مین جو ایک عیسائی مستشرق مسٹر ڈبلو منٹگمری واٹ کے قلم سے رائل ایشیاٹک سوسائٹی،

[1] صفحہ ۴۳ - ۴۴،

گریٹ برٹین کے رسالہ میں شائع ہوا ہے، تحقیق و تفتیش کے جدید طریقے استعمال کرکے بعض نئے مفید معلومات پیش کئے گئے ہین، اس لئے قارئین معارف کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، مضمون کی طوالت اور گرانباری کے خوف سے ترجمے مین دو ضمیمے (ب) اور (ج) اور ضمیمہ (الف) کا وہ حصہ جس مین ہر کتاب کی تصنیف پر علٰحدہ علٰحدہ بحث ہے، حذف کردئیے گئے ہین، اور صرف کتابون کی فہرست دیدینے پر اکتفا کیا گیا ہے، اس کے علاوہ اور کوئی اہم تبدیلی نہین کی گئی ہے،

(مسعود)

مسئلہ اور اس کی اہمیت طباعت کے وجود مین آنے سے پہلے جب کتابون کی نقلیں محدود سے چند ہوا کرتی تھین اشاعت کی دقتوں اور مختلف قسم کی پابندیون سے محفوظ رہنے کے لئے مصنفین کی طرف ان کا غلط انتساب ایک عام بات تھی، غیر مسلمہ عقیدوں کے حامل عام طور پر اپنی کتابین کسی ایسے شخص کی طرف منسوب کردیا کرتے تھے جن کی شہرت بے داغ ہوا کرتی تھی، کبھی ایسا بھی ہوا کرتا تھا کہ ایک شخص اپنے حریف کو بدنام کرنے کے لئے کچھ ملحدانہ تحریرین اس کی تصنیف مین داخل کردیا کرتا تھا چنانچہ ابوبکر رازیؒ، امام شعرانی امام فخرالدین رازی، اور ابن الاعرابیؒ کے ساتھ یہی سلوک ہوا، اس لئے اگر امام غزالیؒ پر بھی یہ مصیبت نازل کی گئی تو تعجب کی بات نہین ہے،

میکڈانلڈ، گولڈزیہر اور آسن آج سے بہت پہلے اس طرف توجہ مبذول کراچکے ہین، میکڈانلڈ نے مضمون مضنون کی تصنیف سے متعلق شبہات ظاہر کئے، کیونکہ اس مین بہت سے ملحدانہ خیالات کی تعلیم دی گئی ہے، گولڈزیہر نے سرالعالمین کے مستند نہ ہونے پر بحث کی، آسن نے ایسی کتابون کی ایک فہرست تیار کی جو یا تو یقینی طور پر غزالیؒ کی تصنیفات نہین ہین، یا ان کے بارہ مین شبہات موجود ہین، اس فہرست مین سرالعالمین کے علاوہ

[1] جزء اول و دوم ۱۹۵۳ء ص ۴۵ - ۲۴۴ [2] حیات غزالی ص ۱۲۱،

Le Livre de Mohamad ibn Toumert

پانچ اور کتابیں الدرۃ الفاخرہ، منہاج العارفین، مکاشفات القلوب، روضۃ الطالبین اور الرسالۃ اللدنیہ شامل ہیں[۱]، خود راقم الحروف نے کچھ دن ہوئے ایک مقالے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ مشکوٰۃ الانوار کا آخری باب غزالیؒ کے قلم سے نہیں ہے[۲]،

غزالیؒ کی تصانیف کے سلسلے میں خاکسار کی مزید تحقیق وتفتیش سے یہ ظاہر ہوا کہ آسن کی مذکورہ بالا فہرست میں بہت اضافہ کی گنجایش ہے، درحقیقت غزالی جیسے عظیم المرتبت مفکر کو پوری طرح سمجھنے کے لئے پہلے اُن کے تمام تحریری سرمایے کا بنظر غائر مطالعہ کرنا ضروری ہے اور ان کی بہت سی تصانیف کے متعلق یہ سوال کرنا چاہیے کہ واقعی وہ اُن کی اصلی تحریر ہے یا نہیں، اور گولڈزیہر کی اس تحقیق کے بعد کہ احیاء العلوم میں بعض عبارتیں جعلی ہیں[۳]، یہ بھی ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ غزالی کی مصدقہ تصانیف میں بھی اوروں کی لکھی ہوئی عبارتیں اور ابواب داخل کردیے جاسکتے ہیں، اس لئے غزالی کی تصنیف کردہ ساری مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کا پوری احتیاط سے ازسرنو مطالعہ کرنا ایک بڑا کام ہے، خدا کرے اہل علم اس درد سر کے بغیر اور جزئی تفصیلات سے قطع نظر کرکے کسی طرح اس امر پر متفق ہوجائیں کہ امام مذکور کی کون کون تصنیفات مصدقہ ہیں، اور کون کون غیر مصدقہ، زیر نظر مقالہ میں صرف دو باتوں کی کوشش کی گئی ہے، اول یہ کہ چند ایسے اصول مرتب کئے جائیں، جن کی مدد سے ہم امام غزالیؒ کی ہر کتاب کو ناقدانہ حیثیت سے پرکھ سکیں، دوسرے یہ کہ ان اصول کو اُن کی کتابوں میں استعمال کرکے جو عام طور پر اُن کی طرف منسوب ہیں، اور آسانی سے ہر جگہ دستیاب ہوتی ہیں، حاصل کردہ نتائج پر روشنی ڈالیں،

تصانیف کے انتساب کی صحت پر بہت سے اہم مسئلوں کا دارومدار ہوتا ہے، مثلاً یہ کہ کیا واقعی امام غزالی نے اخیر عمر میں اشراقیت[۴] کے متعلق اپنے خیالات میں تبدیلی کردی تھی، جیسا کہ ابن رشد کا خیال ہے

---

[۱] جلد چہارم ص ۲۰۵۰ (Espirdualidal De Algagel.) [۲] جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی

گریٹ برٹین ۱۹۲۹ء ص ۵۰ ۔ ۲۲ ص ۱۵۳ [۳] Streitschrift ص ۱۶ [۴] آج کل Neo-Platonism

اور عام رجحان بھی اسی طرف ہے، یا یہ کہ وہ کسی خاص مرکز خیال پر قائم نہیں رہے، اگر یہ ثابت کردیا جائے کہ غزالیؒ کی طرف منسوب وہ عبارتیں جن میں کھلے بندوں اشراقیت کی تلقین کی گئی ہے، مستند نہیں ہیں، تو پھر اشراقیت اور تضاد رائے کے دونوں اعتراضات جو ان پر عائد ہوتے ہیں، دور ہوجاتے ہیں، اسی طرح اس کا بھی صحیح اندازہ ہوسکتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کے اخیر حصہ میں تصوف کی ان شکلوں کی طرف جن میں وحدت الوجود کا عقیدہ پیش کیا جاتا ہے، یا اس اصول کی تلقین کی جاتی ہے کہ ہر شخص کسی واسطہ کے بغیر روحانی وجدان کے ذریعہ خدا کی معرفت حاصل کرسکتا ہے، کس طرح تدریجی ترقی کی یا یہ کہ وہ سرے سے اس کی طرف مائل تھے بھی یا نہیں؛

عام اصول | اس طرح کی تحقیقات کے لئے ایسے ماخذوں کا سہارا ضروری ہے، جن پر پورا اعتماد کیا جاسکے یعنی ہمارے سامنے غزالی کی ایسی تصانیف ہوں جن کے مستند ہونے میں کسی قسم کا شک وشبہہ نہ ہو، جن کے ذریعہ ہم غزالی کے نقطہ ہائے نظر اور اُن کے رجحانات کے متعلق ابتدائی تصور قائم کرسکیں، اس سلسلے میں تہافۃ الفلاسفہ، احیاء العلوم اور المنقذ من الضلال سب سے پہلے ذہن میں آتی ہیں، علم کلام سے متعلق اور چند کتابیں بھی جن میں مستظہری فی الرد علی الباطنیۃ، الاقتصاد فی الاعتقاد اور مقاصد الفلاسفہ[۵] زیادہ مشہور ہیں، اس فہرست میں داخل کی جاسکتی ہیں، راقم نے مشکوٰۃ کے آخری باب پر جو تبصرہ کیا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب کا باقی حصہ غزالی کی مستند تصنیف ہے، مگر ان کتابوں کو مستند قرار دینا بھی صرف اصول مسلّمہ کے طور پر ہے، اس لئے اس بارہ میں بہت احتیاط سے قدم اٹھانے کی ضرورت ہے، مثلاً اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ کسی ایسی عبارت کو جو تنہا کسی ایک جگہ مل جائے، بہت زیادہ اہمیت دینا

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۰) اس کے لئے عام طور پر اردو میں "نوافلاطونیت" کا لفظ استعمال کیا جارہا ہے، مگر میں نے ہر جگہ اس کا ترجمہ "اشراقیت" کیا ہے، کیونکہ غزالی کے فلسفیانہ خیالات کے ذکر میں مجھے یہ لفظ زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے، (مترجم)

[۵] مقاصد الفلاسفہ غزالی کی مستند تصنیف ہے، مگر وہ اُن کے ذاتی خیالات نہیں پیش کرتی ہے،

مناسب نہین ہے، اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ کسی اور شخص نے بعد مین اُس کو کتاب مین داخل کر دیا ہو، اس کے علاوہ کسی ایسے مسئلہ کو اصول تنقید کے طور پر نہین اختیار کرنا چاہئے، جو زیر بحث مسائل کی تصدیق کا محتاج ہو، اس لئے موجودہ حالات مین یہ کہنا مشکل ہے کہ اشراقیت سے تعلق رکھنے والی تحریرین حقیقۃً غیر مستند ہین، غرض جہانتک ممکن ہو داخلی تاثرات اور ایسے قیاسات سے جن مین داخلی عنصر کی کثرت ہو، پرہیز کرنا چاہئے محض یہ کہدینا کافی نہین ہے کہ

"یہ تحریر امام غزالی کی نہیں معلوم ہوتی ہے"،

بلکہ اس سے زیادہ خارجیت کی ضرورت ہے، تصنیف کی صحت انتساب پر گفتگو کرتے وقت تاریخ تصنیف کے تعین کا سوال بھی پیدا ہوتا ہے، اور اس کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ بعض تاریخون مین جو عام طور پر قبول کر لی گئی ہین، ترمیم کا امکان باقی رہتا ہے،[1]

اب مین امام غزالی کی تصانیف کو مستند قرار دینے کے لئے تین اصول پیش کرتا ہون، جو میری نظر مین انتساب کے لئے معیار تسلیم کئے جا سکتے ہین،

۱۔ المنقذ من الضلال مین جو خیالات پیش کئے گئے ہین، ان مین سب سے اہم یہ ہے کہ عقل سے ماورا ایک اور عالم ہے یعنی عالم نبوت یا عالم وحی، اور موخر الذکر عالم کے نقطۂ نظر سے عقل کے بتائے ہوئے بعض بیانات بالکل اسی طرح غلط ہو سکتے ہین، جس طرح عقل کے نقطۂ نظر سے انسان کا عالم حواس سے منزہ ہونا سراسر غلط ہے، انسان کی مذہبی زندگی کے ارتقار کے تین مدارج کا تصور اس نظریہ سے بہت قریبی تعلق رکھتا ہے، مثلاً وہ پہلے انتہائی سادگی کے ساتھ کوئی سوال کئے بغیر اپنے والدین اور اپنے استاد کے عقیدون کو قبول کر لیتا ہے، یہ ایمان کا درجہ ہے، پھر بعد مین بسا اوقات شک وشبہہ کے ایک دور کے بعد وہ اپنے عقیدے کی معقول توجیہ کرتا ہے، اور پھر اس کی حمایت کرتا ہے، اب وہ ترقی کر کے "علم" کے درجہ تک پہنچا ہے،

[1] تاریخ تصنیف کی بحث آگے آتی ہے، (ترجمہ مین یہ حصہ حذف کر دیا گیا ہے، مترجم)

اس سے آگے "ذوق" کی منزل ہے جہان انسان ان چیزون کو وجدانی طور پر جاننے لگتا ہے، جن کو وہ تحقیق اور مطالعہ کی روشنی مین پہلے معلوم کر چکا تھا، تیسرا درجہ خاص طور پر انبیاء اور اولیا کا حصہ ہے، لیکن عام لوگ بھی اس کو تزکیۂ نفس کے ذریعہ حاصل کر سکتے ہین، غرض یہ تینون درجے تین کڑیون کے دو سلسلے ہین، اس کے ایک طرف قوائے حسی، قوائے عقلی، اور قوائے روحانی ہین، اور دوسری طرف علم، عقل اور وجدان، یہ دونون سلسلے اسی ترتیب سے ہر جگہ جمع نہین ہوتے، اوپر کے دو درجے البتہ اسی ترتیب سے اکٹھا ہوتے ہین، مشکوٰۃ اور منقذ دونون مین اُن کا ذکر آتا ہے، اگرچہ مشکوٰۃ مین پہلے سلسلہ کی کڑیان تین سے بڑھا کر پانچ کر دی گئی ہین، یعنی حسی، خیالی، عقلی، فکری، اور سب سے اعلیٰ قدسی نبوی،

جہان تک مین نے تلاش کیا ہے لفظ "ذوق"[1] اس خاص مفہوم مین احیاء العلوم مین کسی جگہ استعمال نہین کیا گیا ہے، اور نہ صرف یہ لفظ موجود نہین ہے بلکہ اس مین جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ ایک بالکل مختلف تصور کے ماتحت بیان کیا گیا ہے، یہ صحیح ہے کہ اس مین بھی اس خیال کی ترجمانی کی گئی ہے کہ انسان اپنے وجدان کے ذریعہ براہ راست مذہبی حقیقتون کو دریافت کر سکتا ہے، لیکن ہر جگہ یہ فرض کیا گیا ہے کہ عقل اور وجدان سے حاصل کئے ہوئے نتائج مختلف نہین ہوتے، بلکہ ایک ہوتے ہین، اس کی جانب کسی طرح کا اشارہ بھی موجود نہین ہے کہ عقل اور وجدان کے درمیان کسی قسم کا اختلاف ہے، عقل کو وجدان پر کوئی فوقیت حاصل نہین ہے، اور یہ دونون مساوی حیثیت کے مالک ہین، چنانچہ کتاب کے آخری باب سے پہلے کے باب مین تفکر پر بحث کرتے ہوئے امام غزالیؒ فرماتے ہین کہ "انسان کو اپنے اکتسابی علم کے استعمال کرنے اور اس سے نفع حاصل کرنے کا شعور کبھی ایک روحانی روشنی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے، جو اس کے دل مین فطری طور پر روشن ہوتی ہے، جیسا کہ انبیاء کرام کے ساتھ ہوتا ہے، اور کبھی مطالعہ اور ریاضت کے ذریعہ اور یہ طریقہ زیادہ عام ہے" اب چونکہ منقذ احیاء کے بعد لکھی گئی ہے، اس لئے یہ فرض کرنا ہوگا

[1] Religious intuition.

غزالی نے عقل اور وجدان کی ہمسری اور ہم آہنگی کے نظریہ سے ترقی کرکے عقل پر وجدان کے تفوق کا نظریہ پیش کیا، اس ترقی کے بعد منقذ کی تصنیف اور اُن کی موت کے درمیان جو مختصر مدت ہے، اس مین غزالیؒ اس مسئلہ کو بھول نہین سکتے تھے، اگر اُن کی راے مین کوئی تبدیلی ہو گئی ہو، تب بھی وہ المنقذ مین بیان کئے ہوئے تمام مسائل سے جن کی تشریح وجدان کی فوقیت ماننے سے ہوتی ہے، کچھ کہے بغیر خموشی کے ساتھ نہیں گذر سکتے تھے، اس لئے یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ جس کتاب مین عقل کا ذکر اعلیٰ ترین قوت کی حیثیت سے کیا گیا ہو، مثلاً معراج السالکین، اور جس مین ان صفات سے بحث کی گئی ہو، جو عقل کی روشنی مین نہین، بلکہ روحانیت کے نور مین سمجھی جا سکتی ہین، وہ منقذ اور مشکوٰۃ کے بعد نہین بلکہ پہلے لکھی گئی ہے،

اس امکان کو بہر حال نظر انداز نہین کرنا چاہیے کہ بغداد سے نکل جانے کے بعد فوراً احیاء کی تصنیف سے پہلے غزالیؒ کی زندگی مین "اشراقیت" کا کوئی دور گذرا ہو، ایسی صورت مین نفسیاتی حیثیت سے دو انتہائی متعارض و متضاد نظریون کی جانب غزالیؒ کا میلان بالکل قرین قیاس ہوگا، اور نتیجے کے طور پر اُن کے مذہبی خیالات کی تدریجی ترقی متناسب نظر آئے گی، لیکن جن کتابون مین عقل کو اولیت دی گئی ہے اُن مین عام طور پر بعض ایسی باتین مذکور ہین، جن کی بنا پر وہ ابتدائی دور کی تصنیف نہین قرار دی جا سکتی ہین، اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ "اشراقیت کے دور" کو احیاء کی تصنیف سے قبل ماننے کے لئے جن شہادتون کی ضرورت ہے وہ کافی نہین ہین،

غرض پہلا معیار وہ رتبہ ہے جو عقل کو دیا گیا ہے، اور یہ بہت واضح ہے، چونکہ بالکل اخیر زندگی مین غزالیؒ کا یہ عقیدہ تھا کہ عقل سے ورا ایک اور عالم ہے، اور قوتِ عقل کے سوا ایک اور قوت ہے، جو عقل سے بھی افضل ہے، اس لئے کوئی ایسی تصنیف جس مین عقل کو اولیت حاصل ہو، اس عہد کی یادگار نہین ہو سکتی لیکن یہ معیار اس لحاظ سے محدود ہے کہ کسی کتاب کے ابتدائی عہد کی تصنیف قرار

دیئے جانے کا امکان باقی رہ جاتا ہے،

۲- دوسرا اصول جس سے ہم نے بہت مدد لی ہے، یہ ہے کہ غزالیؒ اپنی تصنیفات کو ربط و تسلسل کے ساتھ اور منطقیانہ طرز پر ترتیب دیتے ہین، اس کی مثال مین مشکوٰۃ کا وہ حصہ جو مستند ہے، اور جس کی ترتیب بڑی احتیاط سے کی گئی ہے پیش کیا جا سکتا ہے، مگر یہ خصوصیت ان کی ان تمام کتابون مین ملتی ہے جنھیں ہم بحث کی ابتدا مین مستند مان چکے ہین، غرض یہ ایک دوسرا معیار تنقید ہے، اور پہلے کی طرح یہ بھی متعین اور محدود ہے، کیونکہ غزالیؒ کی ایسی کتابین بھی موجود ہین جن مین متفرق مباحث کو کسی واضح اصول کو پیش نظر رکھے بغیر ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے اس لئے اُن کے متعلق ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہین کہ وہ غزالیؒ کی تصنیف نہین ہین،

مگر یہ مسئلہ بعض حیثیتون سے پیچیدہ بھی ہے، اس لئے کہ غزالیؒ کی مستند کتابون مین کچھ ایسے ابواب ملتے ہین جن کی اندرونی ترتیب تو نہایت واضح اور منطقیانہ ہے، مگر کتاب کے باقی حصہ سے ان کا کوئی قریبی ربط نہین ہے، ایسی صورت مین ہم اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتے ہین کہ پوری کتاب کی ترتیب غزالی کے ہاتھون نہین انجام پا سکی، گو اس کے مختلف ابواب اُن ہی کے قلم کے نتائج ہین،

درحقیقت غزالیؒ کا مستند تحریری سرمایہ متفرقات اور انتخابات کی نوع کی کتابون کے انبار مین چھپا ہوا ہے جس کی وجہ سے تمامی دشواری مین اضافہ ہو جاتا ہے تاہم مربوط اور منطقیانہ طرز تحریر و بیان بھی مدد دیتی ہے اگر کوئی عبارت دو کتابون مین ملتی ہے، اور ان مین سے ایک مین تو اگلی اور پچھلی عبارتون مین واضح اور منطقیانہ ربط ہے، مگر دوسری مین نہین، تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہین کہ دوسری کتاب مین وہ عبارت غزالیؒ کے علاوہ کسی اور شخص نے داخل کر دی ہے، خصوصاً جب کہ الفاظ بجنسہ وہی ہون، یا اُن مین ذرا سی تبدیلی کر دی گئی ہو، اگر محض کسی عبارت کی تکرار اس کے جعلی ہونے کی دلیل نہین بن سکتی، کیونکہ غزالی کبھی ایک ہی الفاظ مین اور کبھی کچھ تغیر کے ساتھ اکثر اپنی تحریرون کا اعادہ کرتے ہین، المنقذ کے آخر مین پیدائش کا بیان اور اباحیہ کا ابطال، اور احیاء اور بدایہ مین رسمی عبادت کی بحث اس کے چند نمونے ہین، یہان یہ بیان کرنا چندان ضروری نہین معلوم ہوتا کہ

ایک کتاب یا ایک عبارت واضح اور منطقیانہ ترتیب کے باوجود جعلی ہو سکتی ہے، اور متفرقات اور انتخابات کی نوع کی کسی کتاب میں غزالیؒ کی لکھی ہوئی کوئی ایسی عبارت مل سکتی ہے، جو کسی مستند تصنیف میں نظر نہ آتی ہو، مگر چونکہ وہ کتاب مجموعی حیثیت سے مشتبہ ہے، اس لئے جب تک عبارت مذکور کے مستند ہونے کا کوئی خاص ثبوت نہ مل جائے، غزالیؒ کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے میں اس سے مدد نہیں لیجا سکتی ہے،

۳۔ تیسرا اصول جسے معیار قرار دیا جا سکتا ہے، وہ غزالیؒ کا وہ مسلک ہے، جو انھوں نے عام تسلیم شدہ اسلامی عقائد و اعمال کے بارہ میں اختیار کیا ہے، میکڈانلڈ نے حیات غزالیؒ میں یہ خیال ظاہر کیا ہو کہ مشرب تصوف اختیار کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ امام اشعری کے پیرو نہیں رہے، منقذ میں غزالیؒ نے اس امر کی پوری وضاحت کی ہے کہ تہافۃ الفلاسفہ میں اشراقیت کے خلاف انھوں نے جو تنقید کی تھی، اس پر وہ اب بھی قائم ہیں، مشکوٰۃ میں اہل سنت والجماعۃ کے عقائد کے ساتھ ان کا شغف اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ گویا کو گھر میں نہ رکھنے والی ہدایت پر بالکل لفظی مفہوم میں عمل کرنے کی تلقین کرتے ہیں، اسی طرح ان تمام کتابوں میں جو مندرجہ بالا سطور میں مستند تسلیم کی گئی ہیں، انھیں ہر جگہ اپنے متعلق عقیدۂ عام کا حامل سمجھے جانے کی بڑی فکر رہتی ہے، اور وہ ایک فقیہ کی طرح مومن، مشرک اور کافر وغیرہ الفاظ کے استعمال میں بڑی احتیاط کرتے ہیں، چونکہ یہ خیال منقذ اور مشکوٰۃ دونوں میں ظاہر کیا گیا ہے، اس لئے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اخیر عمر تک اس پر قائم رہے، البتہ بالکل اخیر کے ایک یا دو سال میں کسی فوری تبدیلی رائے کے متعلق کوئی تشفی بخش بیان نہیں ملتا ہے، اگر کوئی تبدیلی ہوئی ہو تو اسے ضعیف العمری پر محمول کرنا حق بجانب ہوگا، اس لئے کہ عمر بھر کے عقائد سے رجوع کرنے کی تائید میں ان کی کوئی اطمینان بخش تحریر نہیں ملتی ہے، اگرچہ مجموعی حیثیت سے رجعت کا امکان باقی رہتا ہے، لیکن اس پر بہت زیادہ غور کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی ہے، اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کوئی ایسی کتاب جس کا مطمح نظر جمہوری عقیدہ نہ ہو یا جس میں اشعری عقائد پر نکتہ چینی کی گئی ہو، وہ غزالیؒ کے بالکل آخری دور کی تصنیف نہیں ہو سکتی ہے، اگر دوسری

سلہ ص ۱۲۱،

طرف یہ امکان باقی رہ جاتا ہے کہ وہ بغداد سے فرار ہونے کے فوراً بعد والے دور کی تصنیف ہو، عقائد اہل سنت والجماعۃ کی حمایت کا یہ نظریہ بہت مفید ہے، اور اشراقیت کے ایک فرضی اگلے دور سے بڑی مناسبت رکھتا ہے، لیکن اس بارہ میں اب تک جتنی شہادتیں دستیاب ہو سکی ہیں، وہ اسے ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہے، یہ تیسرا معیار تنہا کچھ بہت زیادہ مفید نہیں ہے، اس لئے کہ ایسے بیانات مشکل سے ملتے ہیں جن سے اس سلسلے میں کوئی واضح نتیجہ اخذ کیا جا سکے، لیکن یہ دوسرے معیاروں کی تائید میں بہت کام دے سکتا ہے،

غرض یہ تین معیار ہیں جن کی مدد سے غزالیؒ کی اصلی اور جعلی تصنیفات میں امتیاز کیا جا سکتا ہے، راقم نے ان کے ذریعہ اور بعض دوسرے جزئی امور کو سامنے رکھ کر غزالی کی اصلی اور جعلی تصانیف پر سرسری نگاہ ڈالی، جو آسانی سے دستیاب ہو سکیں، اور چند واضح اور نمایاں حقیقتیں جن سے غزالی کی جانب ان کے انتساب کی صحت اور عدم صحت کا ثبوت ملتا تھا، قلمبند کر دیں، ہر کتاب پر علحدہ علحدہ بحث ایک ضمیمے میں کی گئی ہے، اس تحقیق و تفتیش سے مجموعی طور پر جو نتائج حاصل ہو سکے ہیں، اب ان پر روشنی ڈالی جاتی ہے،

مشروحا نتائج اور فیصلے　ان کتابوں یا ابواب کی تعداد جو جعلی ہونے یا کم از کم حد درجہ مشکوک ہونے کی بنا پر مسترد کر دیئے جانے کی مستحق ہیں، بہت زیادہ ہے، اس سلسلہ میں سب سے پہلے آسن کی وہ فہرست ہے، جس میں چند کتابیں شامل ہیں، اور جس کی تصدیق میں بھی کرتا ہوں، اس پر میکڈانلڈ کی مسترد کردہ کتاب اجوبہ کا بھی اضافہ کیجئے، اس کے بعد مندرجۂ ذیل کتابیں ہیں،

"کیمیائے سعادت (عربی) المضنون الصغیر، منہاج العابدین، معراج السالکین، اور میزان العمل، اور معراج القدس، راقم الحروف کی نظر سے نہیں گذری ہے، لیکن آسن نے اس کا جو حال لکھا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی اسی سلسلہ میں داخل ہے۔ اس کے بعد مختلف کتابوں کے مندرجۂ ذیل ابواب ہیں:-

ہدایہ کی تیسری فصل، املاء میں تعریف کا بیان، اور مشکوٰۃ میں پردہ کی فصل، یہ کل ۱۲ کتابیں اور ۳ معتد بہ ابواب ہوئے،

پہلے معیار کی رو سے امام غزالیؒ کی مستند کتابیں چار مختلف دوروں کے لحاظ سے سرسری طور پر چار حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں، چار مختلف دور یہ ہیں :-

۱- علم کلام پر ابتدائی تصانیف جو احیاء کے ذکر سے خالی ہیں،

۲- احیاء، اور وہ کتابیں جن میں احیاء کے موضوع سے ملتے جلتے خیالات پیش کئے گئے ہیں،

۳- علم کلام سے متعلق بعد کی تصانیف جن میں احیاء کا ذکر ہے لیکن عقل سے وراء کسی اور عالم کا تصور نہیں پیش کیا گیا ہے، اور نہ ذوق کا لفظ اصطلاحی مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے،

۴- وہ کتابیں جن میں لفظ ذوق اس مفہوم میں مستعمل ہوا ہے ؛

چار دوروں کی تقسیم کتاب کے موضوع و مبحث کے لحاظ سے کی گئی ہے، اس لئے وقت کے لحاظ سے ان میں خلط ملط ہو سکتا ہے، گو بعض دوسری کتابوں کے حوالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اختلاط کچھ بہت زیادہ نہیں ہے، اس لحاظ سے کتابوں کی تقسیم یہ ہے،

۱- مقاصد الفلاسفہ، تہافۃ الفلاسفہ، معیار النظر، مستظہری فی الرد علی الباطنیہ، اور الاقتصاد فی الاعتقاد،

۲- احیاء العلوم، بدایۃ الہدایہ، الحکم فی مخلوقات اللہ، المقصد الاقصیٰ، املاء علی مشکل الاحیاء، مضنون، جواہر القرآن، اربعین اور کیمیائے سعادت، (فارسی)

۳- القسطاس المستقیم، الجام العوام،

۴- ایہا الولد، المنقذ من الضلال، اور مشکوٰۃ الانوار،

ان کے علاوہ الادب فی الدین، قواعد العشرہ، رسالۃ الطیر، اور الرسالۃ الوعظیہ بھی میری نظر سے گذری ہیں اور غالباً مستند ہیں، لیکن یہ اتنی غیر اہم اور ابتدائی تصانیف ہیں کہ اس تحقیقات کے سلسلے میں ان کا ذکر نہ کرنا ہی بہتر تھا، انہوں نے رسالۃ الاعتقاد اور التبر المسبوک کا جو حال بیان کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے

کہ یہ دونوں موضوع کے لحاظ سے رسالۃ الوعظیہ سے مشابہ اور غالباً مستند تصانیف ہیں،

خاتمہ | یہ وہ نتائج ہیں جو اس موضوع پر ابتدائی اور سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد حاصل ہوئے ہیں، تاہم تحقیقات کی سطحی نوعیت سامنے رکھنے پر بھی انتساب کی عدم صحت پر جو شہادتیں ملتی ہیں، وہ بہت کافی وزن رکھتی ہیں، راقم کا ہرچند یہ دعویٰ نہیں ہے کہ مسترد تصانیف کی فہرست میں جتنی کتابیں درج کی گئی ہیں، ان سب کے جعل کو اس نے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے، لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہے کہ کم از کم پہلی نظر میں اُن کے معتبر ہونے کے خلاف شبہات ضرور پیدا ہو گئے ہیں، اور اگر کوئی شخص ان کتابوں کی مدد سے غزالیؒ کے متعلق کوئی خیال ظاہر کرنا چاہے تو اس کو اپنے ماخذ سے استفادہ کرنے کے لئے دلیل پیش کرنے کی ضرورت ہوگی،

مزید تفصیلی تلاش و تحقیق خصوصاً ملتی جلتی ہوئی عبارتوں کی تلاش سے صحتِ انتساب کے مسئلے پر کچھ اور بھی روشنی پڑ سکتی ہے، لیکن اگر غزالیؒ کی علمی اور مذہبی ترقی کے حالات بیان کئے جائیں، تو اس سے مجموعی طور پر زیادہ مفید معلومات حاصل ہو سکیں گے، اسی طرح اگر دوسرے نظریات سے قطع نظر کر کے انتساب کی صحت و عدم صحت کے نظریہ کی رو سے غزالیؒ کی علمی زندگی کی نشوونما کا مربوط و مسلسل حال بیان کیا جائے، تو اسے ثابت کرنے میں بڑی آسانی ہوگی، ممکن ہے پروفیسر ماسگنٹن کی رائے کے مطابق غزالی کے یہاں چھوٹے چھوٹے مسئلوں میں متناقض رائے پایا جاتا ہو، اگرچہ ایک بڑے مفکر کو ایسا نہ ہونا چاہیے، مگر اہم اور اصولی مسائل میں وہ ہمیشہ ایک جگہ قائم رہتے ہیں، اگر اس میں ترمیم بھی کرتے ہیں، تو اُن کی ترمیم بہت معقول ہوتی ہے، اور جب تک اُن کی متناقض رائے کا کوئی ثبوت نہ مل جائے میرا یہی عقیدہ ہے اور غزالی سے دلچسپی رکھنے والے ہر طالب علم کا یہی عقیدہ ہونا چاہیے،

سردست جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے، وہ غزالیؒ کی زندگی کے مختلف ادوار میں امتیاز و تفریق

---

[1] ص ۹۲ (Recueil.)

کی جانب ان کا رجحان ہو اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ اس سے انھون نے بہت سی باتین سیکھین، مگر تہافۃ الفلاسفہ یں جن ملحدانہ مسلمات پر انھون نے نکتہ چینی کی، اُن کو کبھی بھی انھون نے قبول نہین کیا،

مندرجۂ بالا سطرون مین غزالیؒ کے جو خط و خال نظر آتے ہین، وہ اس تصویر سے کسی حد تک مختلف ہین، جو عام طور پر کھینچی گئی ہے، اس مین "اعلیٰ تصوف کی وہ باتین" جن کی طرف عام خیال کے مطابق وہ اپنی زندگی کے آخری دنون مین مائل ہو گئے تھے، غائب ہین، اور ان کے بجائے وہ علم کلام اور فقہی مسائل ۵ مین بالکل محو نظر آتے ہین، اور جہان تک مسائلِ تصوف کا تعلق ہے، وہ اس مین احیاء کی منزل سے کچھ زیادہ آگے نہین بڑھے ہین،

غزالیؒ کی بعض تصانیف کو جعلی قرار دینے سے اُن کی قدر و قیمت بالکل ختم نہین ہو جاتی ہے، اور ان میں سے بعض اس لئے توجہ کی مستحق ہین کہ اشراقیت اور یونانی تصوف کو اسلامی ماحول سے ہم آہنگ کرنے کے لئے جو کوششین کی گئی ہین، وہ اُن کی وضاحت کرتی ہین،

ضمیمہ | وہ کتابین جنھیں آسن یا میکڈانلڈ نے جعلی قرار دیا،

کتاب الدرۃ الفاخرۃ فی کشف علوم الآخرۃ (ناشر گاٹیر، طبع لیبزگ ۱۸۷۸ء) منہاج العارفین (فرائد اللآلی کے ساتھ شائع ہوئی ہے، طبع قاہرہ ۱۳۴۳ھ ص ۲۰ - ۱۱۰) کتاب مکاشفات القلوب (طبع قاہرہ ۱۳۰۰ھ) روضۃ الطالبین وعمدۃ السالکین (فرائد اللآلی کے ساتھ شائع ہوئی ہے، طبع قاہرہ ۱۳۴۳ھ) الرسالۃ اللدنیہ (مختلف ایڈیشن) کتاب سرّ العالمین وکشف ما فی الدارین (طبع قاہرہ ۱۳۲۸ھ، صفحات ۱۱۱) اجوبہ (عبرانی، ناشر اسٹیج مارٹ ۱۸۹۶ء)

دوسری غیر مستند کتابین:-

کیمیائے سعادت (عربی ترجمہ، الجواہر الغوالی کے ساتھ شائع ہوئی ہے، طبع مصر ۱۳۴۳ھ صفحہ ۵۰۱۹)

---

۵ Speculative Theology

المضنون الصغیر (کتاب الجام العوام کے ساتھ شائع ہوئی ہے، طبع قاہرہ ۱۳۰۹ھ) منہاج العابدین (طبع قاہرہ ۱۳۱۳ھ، صفحات ۱۰۸) کتاب معراج السالکین (فرائد اللآلی کے ساتھ شائع ہوئی ہے، طبع قاہرہ ص ۹۹ - ۱) میزان العمل (طبع قاہرہ ۱۳۲۸ھ)

مستند کتابون کے جعلی حصے:-

بدایۃ الہدایہ (طبع قاہرہ ۱۳۰۳ھ جو کہ ۱۳۲۳ھ صفحات ۷۰) کا آخری باب، کتاب الاملاء فی اشکال الاحیاء (کتاب الاتحاف مصنفہ سید مرتضیٰ جزو اول کے حاشیہ پر، طبع قاہرہ ۱۳۱۱ھ) کی تمہید، مشکوٰۃ الانوار (مختلف ایڈیشن) کا آخری باب پردہ۔

سلسلۂ سیر الصحابہ

مہاجرین حصہ اول

اس مین خلفائے راشدینؓ کے علاوہ بقیہ حضرات عشرۂ مبشرہ اکابر بنی ہاشم و قریش، اور اُن صحابہؓ کے حالات و سوانح اخلاق اور فضائل کی تفصیل بیان کی گئی ہے، جو فتح مکہ سے پہلے اسلام لائے شروع مین ایک مفصل مقدمہ مین قریش کی تاریخ اور قبائل مہاجرین کی تفصیل کی گئی ہے، اور مہاجرین کے مخصوص فضائل بیان کئے گئے ہین، قیمت:- ؏

سیر الصحابہ جلد ششم

اس مین عہد صحابہ کی چار اہم ہستیون، حضرات حسنینؓ، امیر معاویہؓ، اور عبد اللہ بن زبیرؓ کے مفصل حالات و سوانح اخلاق و فضائل، اور اُن کے مذہبی اخلاقی اور سیاسی مجاہدات اور کارنامون اور ان کے باہمی سیاسی اختلافات کی تفصیل، واقعہ کربلا اور معاویہ کے متعلق اردو مین اس سے زیادہ مستند حالات نہین مل سکتے، قیمت ؏

"منیجر"

ضعیفی دکنی کی ایک اور خاص تصنیف

نصیحت مدن[1] یا نقل نامہ[2]

از

جناب محمد سخاوت مرزا صاحب بی اے ال ال بی (عثمانیہ)

شیخ داؤد[3] نام ضعیفی تخلص، مگر وطن کے متعلق کسی تذکرہ مین کوئی مواد نہین ملا، مولوی نصیرالدین ہاشمی[4] نے لکھا ہے کہ ضعیفی قطب شاہیون کے آخری دور مین گزرے ہین، مگر ہماری تحقیق مین ان کا تعلق گولکنڈہ کے شعراء سے نہین ہو،

مولوی حکیم شمس اللہ قادری صاحب نے بھی اس پر کوئی روشنی نہین ڈالی، اور لکھا ہے کہ اُن کی تصنیف ہدایت ہندی عالمگیری دور کی پیداوار ہے، اس کا سنہ تصنیف دراصل ۱۱۰۱ھ ہے، خود مصنف نے بھی یہی لکھا ہے :-

صدی بارہویں کا لگیا تھا برس — اسے پنچہ باجیا لو دکھنی جرس

مگر حکیم شمس اللہ صاحب نے ۱۱۰۱ھ لکھا ہے، جو صحیح نہین[5]،

ضعیفی عالم فاضل، بڑے متقی و پرہیزگار اور عارف کامل تھے، پر دفیسر زور حیدر آبادی کا

---

[1] اردوے قدیم مؤلفہ شمس اللہ قادری مطبوعہ نولکشور [2] دکن مین اردو، مؤلفہ نصیرالدین ہاشمی، مطبوعہ حیدر آباد،

[3] اردوے قدیم

خیال ہو کہ ضعیفی ہی پہلا شخص ہے جس نے عالمگیر کی مدح لکھی ہے، اور اُن کو ایک مورخ شناس ثابت کرنیکی کوشش کی ہے،

سوال یہ ہو گیا اس دور کے دوسرے شعراء نے مدح نہین کی، شاہ محمود بحری نے بھی تو عالمگیرؒ کی تعریف کی ہے، فتح بیجاپور کے بعد کیا کسی کو جرأت ہو سکتی تھی کہ شہنشاہ عالمگیر کے خلاف کوئی قلم اٹھائے اور حضرت عالمگیرؒ کے تقدس و تورع، تقویٰ و توحید اور اتباعِ شریعت مین کسی کو کیا کلام ہو سکتا ہے؟ اگر ضعیفی نے اس کو وہی سمجھا تو کیا بُرا کیا،

ایک نئی بات جواب کتاب ہذا کی داخلی شہادتون سے معلوم ہوئی، وہ یہ ہے کہ ضعیفی کا شمار قطب شاہی مصنفین مین تھا، بلکہ ان کا تعلق بیجاپور سے تھا، کیونکہ اُن کو بیجاپور کے ایک بہت بڑے بزرگ سید محمد حسینی عرف شاہ حضرت بیجاپوری المتوفی ۱۱۰۸ھ سے بیعت تھی، چونکہ تصنیف زیر تذکرہ شاہ صاحبؒ کے وصال کے بعد تصنیف ہوئی ہے، اس لئے ضعیفی کی سکونت یقیناً بیجاپور مین تھی، چنانچہ وہ لکھتے ہین،

بڑے بخت میرے جہانگیر ہین — کہ حضرت حسینیؒ مرے پیر ہین
بھوت فیض پایا ہوں اوس پیر تھے — شرف ہوا بھوت دستگیر تھے
طریقہ جو تھا شاہ کا بے بدل — نہ دیکھیا سنیا ہور آتیا کوئی اوّل
شریعت کا یک جھاڑ نہ لائے تھے — طریقت کو کر شاخ دکھلائے تھے
حقیقت کے پھولاں لگا شاخ پر — اسی گل کون کر معرفت کا ثمر
پھل پیچ میوے۔ بہتر ال کا — سو وحدت اٹھا شاہ کے حال کا

---

[1] فہرست مخطوطات ادارہ ادبیات جلد اوّل مطبوعہ حیدر آباد [2] مخطوطہ نصیحت مدن کتبخانہ آصفیہ،

[3] تاریخ ادب اردو دکن مؤلفہ عبدالجبار خان ملکاپوری،

بدل جان ضعیفی خدا ہوے کر رہے شہ کے روضہ مبارک اوپر

ضعیفی کا ایک ہمعصر مختار بیجاپوری مصنف معراج نامہ[1] مصنفہ ۱۰۹۰ھ بھی حضرت شاہ کا مرید تھا،

معراج نامہ مختار میں اس کا اشارہ موجود ہے،

تون کا محمد حسینی ہے ناؤن | مرے سر پہ اوس کی ہمیشہ ہی چھاؤن
گرا وشاہ حضرت سون مشہور ہے | کہ فیض اوس کا دو جگ مین معمور ہے

نیز شاہ محمود بحری مصنف من لگن کے ایک مرید نے بحوالہ بحری شاہ حضرت کا ایک یہ قول نقل

کیا ہے[2]

"اے عزیز عارسے فی بحضرت ہادی میان شاہ از اولاد گیسو دراز نور اللہ مرقدہ پرسید

منتی در آخر حال بچہ حال باید بود گفتند انا کہ ما حی بشرک و کثرت و محی وحدت و یکتا ئی ہمیں

انا باشد و نیز بارہا فرمودند در گرگی ملامت کنندگان اندہ کشندگان اخواہم بدار السلطنت یعنی

بیجاپور دم ہنگامہ منصور از سر تازہ کنم دوزخ خود را بیاد ماتیم"[3]

شاہ حضرت بیجاپوری نے حضرت مخدوم جہانیان جہان گشت اور سید اشرف جہانگیر سمنانی

قدس سرہم العزیز جیسے سیکڑون محققین صوفیا سے فیض پایا، اور خرقے حاصل کئے، چنانچہ شاہ صاحب

اپنی کتاب مراد المریدین[4] میں جس کا تاریخی مادہ

"مراد المریدین بحجت جمیل"
۱۰۱۴ھ

ہے، اپنے ایک سو اکتیس خاندانوں کی تفصیل دی ہے، جن میں بعض یہ ہیں:-

کبرویہ، گازرونیہ، نجاریہ، رفاعیہ، مدنیہ ابی سعید ابو الخیریہ، دقاقیہ، حمویہ، طاوسیہ،

---

[1] معراج نامہ مختار مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد [2] مجموعہ تصوف مؤلفہ موسیو مولیان فرانس مطبوعہ

[3] مراد المریدین مخطوطہ آصفیہ،

تبرنیہ، ضعیفیہ، علائیہ، حرزیہ، عطاریہ، جلالیہ، سندتقیہ الحمیریہ، باقیہ اشرفیہ، حسنیہ، صدیقیہ، فاروقیہ،

عثمانیہ، وردائیہ، الیاسیہ، عباسیہ، بلخیہ، وغیرہ،

ڈاکٹر زور حیدرآبادی کا بیان ہے کہ فتح شریف بلخی مصنف پندنامہ لقمان (تصنیف ۱۱۰۲ھ)

نے ہدایت ہندی ضعیفی میں ۲۰۰ بیت کا اضافہ کیا تھا،[1] یہ نسخہ ہماری نظر سے نہیں گزرا، اگر یہ صحیح ہے تو

بہت ممکن ہے کہ فتح شریف بلخی آخر الذکر خاندان بلخیہ سے تعلق رکھتے ہوں، اور ضعیفی کے برادران طریقت

میں سے ہوں، غرض ضعیفی شاہ محمود بحری، مختار بیجاپوری، صنعتی، و نصرتی بیجاپوری، فراقی بیجاپوری

معاصر تھے، اور سلطان علی عادل شاہ ثانی اور سکندر عادل شاہ کا زمانہ پایا، اور عالمگیر کے زمانہ میں

زندہ تھے، ان کی تاریخ وفات کا پتہ نہیں چلا، فہرست کتبخانہ آصفیہ میں ان کی تصنیف ہدایت

ہندی نمبر ۸۰۳ کے محاذی سنہ وفات ۱۱۲۶ھ درج ہے مگر کسی اور شہادت سے اس کی تصدیق

نہ ہو سکی، فہرستوں کے بعض سنین اور کتابوں کے نام غلط ثابت ہوتے ہیں اسلئے اس کو موثق نہیں کہا سکتا مگر

اتنا مسلم ہے کہ یہ اپنے مرشد کی وصال ۱۰۱۱ھ کے بعد تک زندہ تھے، جس کی تصدیق نقل نامہ زیر تذکرہ

سے ہوتی ہے،

تصانیف | ان کی تصانیف میں اب تک ہدایت ہندی اور ایک قصہ عشق صادق[2] (ترجمہ فارسی) منظر

عام پر آچکی ہے، ایک تیسری کتاب نصیحت مدن یا نقل نامہ جس کا کسی تذکرہ میں ذکر نہیں کیا گیا ہے پیش

کیجاتی ہے، ضعیفی غالباً صاحب دیوان بھی تھے، چنانچہ چھ دکنی غزلیں[3] بھی ہدایت ہندی کے ایک نسخہ سے

دستیاب ہوئی ہیں جن کو ہم آخر میں درج کریں گے، ہدایت ہندی فقہ حنفی کی ایک مستند اور مقبول کتاب

رہی ہے، جس کے حوالے خزانۂ عبادت[4] مصنفہ شاہ محمد دکھنی میں جا بجا موجود ہیں، جو ۱۱۶۵ھ کی تصنیف ہے

---

[1] فہرست ادارۂ ادبیات جلد اول [2] فہرست کتبخانہ انڈیا آفس مرتبہ بلوم ہارٹ ص ۴۰ مجموعۂ کتاب دکھنی ص ۲۵

قدیم مطبوعہ ۱۸۷۰ء شمس اللہ قادری جلد اول [3] ہدایت ہندی نسخہ کتبخانہ آصفیہ،

جس سے پتہ چلتا ہے، کہ ہدایت ہندی مصنفہ ۱۱۰۱ھ تو دکھنی مسلمانون کے زیر مطالعہ رہی ہی،

نصیحت مدن[1]: کتب خانہ آصفیہ کا ایک نایاب مخطوطہ ہے، فہرست مین اس کتاب کا نام غلطی سے نصیحت بدن درج ہوگیا ہے، اگر ہماری راے مین اس کا صحیح نام نصیحت مدن ہونا چاہیے، مصنف نے خود اس کے دو نام نقل نامہ اور نصیحت مدن لکھے ہین، غالبًا کاتب کی غلطی سے ایک نقطہ کے اضافہ نے میم کو "ب" بنا دیا ہے،

اس کا موضوع عورتون کے متعلق ایسے پند و نصائح ہین جن کا تعلق سماج سے ہے، اور اُن کو عورتون ہی کی زبان مین لکھا ہے، اسلوب بیان نہایت دلچسپ اور زبان قدیم مگر شیرین ہے، شاعرانہ خوبیان بدرجہ اتم موجود ہین، ضعیفی کی یہ سب سے پہلی تصنیف نہین معلوم ہوتی، غالبًا ہدایت ہندی کے عرصہ دراز کے بعد لکھی گئی، ضعیفی کے بعض اشعار سے، جو مناجات سے متعلق ہین، پتہ چلتا ہے کہ یہ ضعیفی کی آخری زمانہ کی تصنیف ہے، اور اُن کے پیر و مرشد حضرت حسینی المتوفی ۱۱۰۰ھ کے وصال اور ہدایت ہندی ۱۱۰۱ھ کے بعد لکھی گئی ہے، جس کا اشارہ اس کے اشعار مین موجود ہے، اور چونکہ یہ ایک بالکل اچھوتا موضوع تھا، اس لئے اس کو شاعر نے "نزل نخجل" سے مخاطب کیا ہی،

مناجات ۲۵ - ابیات پر مشتمل ہے، جس کے ضمن مین ضعیفی نے وجہ تالیف نام کتاب اور اس کے مضامین کو بھی ظاہر کیا ہے، جو یہ ہے،

الٰہی سکت مجکون دے اے قدیر　　جو نقلان[2] عجائب کہون بے نظیر
الٰہی دے توفیق منجہ یو تمام　　جو دکھنی مین کچھ آنیکر شیرین کلام
کہون جو کرون دلکون کھنیان کے شاد (یہ)　　کہ تا اس مین او کچھ ہے پاوین مراد (یہ)
بھروسا نہ کچ ایک جینے کیرا　　نہ امید دہر اس بنینے کیرا (کیا)

[1] مخطوطہ نصیحت مدن کتبخانہ آصفیہ نمبر ۳۰۴ مثنویات اردو [2] نقل کی جمع نقلان،

دیک آخر تحقیق مرنا ہے جان　　جو یکبار یان تے گذرنا ہے جان
نبران مین بٹھا آپنے دل مین آن　　کہ بعد از مرے یو اچھے کچھ نشان
اسی واسطے یک نشانی بدل　　بنایا نو انظم نزل نخجل

گویا یہ تصنیف ضعیفی کی ہدایت ہندی کے بعد عورتون کے لئے ایک انوکھی چیز ہے، اور اس کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ ضعیفی اردو ادب کا شاید وہ پہلا دکھنی شاعر ہے، جس نے مولانا حالی حافظ نذیر احمد اور اکبر الہ آبادی کی طرح اپنی ماؤن بہنوں، بیٹیون کے لئے پند و نصائح کا دفتر کھولا تھا، اور اُن کے ادب کا افتتاح کر کے ایک بہشتی جھومر تیار کیا، گیارہوین صدی سے پہلے عورتون کے متعلق ایسا لٹریچر موجود نہ تھا، غرض ضعیفی نے عورتون کے لئے وہ دُر نایاب نکالے ہین، جو آج کل کی یورپ زدہ تعلیم و تربیت کے مقابلہ مین قابل رشک ہین، چنانچہ کہتا ہے،

جو اس مین اچھے کچھ بھی آداب و پند　　پڑے کچھ بھی اس کون کرے کوئی پسند
کھے نقل جو دین کے ناقلان　　ادب پند بوے ہین جو عاقلان
او نتیجہ پا کر ادب پند مین　　رکھیا پند دکھنی سنے بند مین
روشیان[1] جو نیکان کیان تن سو کر (روش)　　اد بیان کے آداب جن چو نکر
کیتے حکمتان ہور منز سک لیا (سکھا)　　زبان کے قلم سون اوسے لک لیا (لکھا)
رسالہ یو نقلان سون نادر اچھے　　دلیکن بزرگان سون صادر اچھے
سو یک اس رسالہ کیری چھاؤن مین　　کیا نقل نامہ لگر ناون یہی
بھی دیک اس رسالہ کے مطلب کدن[2]　　رکھیا ناؤن دوجا[3] نصیحت مدن[4]،

[1] بھانا، خیال کرنا [2] او نتیجہ = اونہین سے [3] کدن = بمعنی مناسبت سے [4] دوجا = دوسرا - [5] نصیحت مدن = تہذیب و تمدن سے متعلق نصیحتیں،

نصیحت . . ن نقل نامے کون کیے — یود و ناون بہی اس رسالہ کو رہے

خدا دیوے توفیق دل ہات کون — جو تمت کون انپڑا وون[1] اس بات کون

ضعیفی نے یون حق سے توفیق منگہ — سو دوڑا ئیا وین (دہیں) بجن کا تر نگہ[2]

زیر نظر مخطوطہ کے جملہ اشعار کی تعداد (۳۸۲) ہے اور وہ کئی کاتبون کا لکھا ہوا ہے، چونکہ یہ نسخہ ناقص الاخر ہے اس لئے اشعار کی صحیح تعداد نہین بتائی جاسکتی، ترقیمہ سنہ کتابت درج نہین، البتہ نام مالک یہ ہے۔

حہ "این کتاب مالک قادر محی الدین عطار است"

جس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اور بھی کتابین کتب خانہ آصفیہ مین موجود ہین، اور یہ شخص مدراس کا باشندہ ہے،

آخری دو بیت یہ ہین :-

منگوں پاک رب پہ تے کن اتیا — تون کرمری زن کون نین کا عطا

کر دہرتی اما وے دل میں کلکوت یو — جو دیکھون گگر ابنا پوت یو

ابتداء — اوّل نام اللہ ہے رحمان رحیم — پڑدن نادن اور ول سے ہم کریم

نعت — ضعیفی کے دل کا ہے سیر طیر — کہ صدقے نبی کے ہوئے ختم خیر

مدح صحابہؓ — اس مین ۱۰ بیت حضرت علیؓ کی منقبت مین بھی ہین، جس کا ایک شعر یہ ہے :-

ہو کنز الغموم ہور بحر العلوم — زکی ہور نقی ہور تقی با حلوم؟

منقبت حضرات حسنین و فاطمہ و امہات المومنین مین ۱۱ بیت ہین،

منقبت غوث الاعظم مین ۱۲ بیت آخر بیت مین تخلص ضعیفی ہے،

ضعیفی تمہارے مریدان مین آ — ہوا جمع دو جگ کے دولت کو پا

[1] یعنی ختم کردن [2] بات کا گھوڑا (اسپ سخن)

پیر کی منقبت مین ۱۲ بیت ہین، جن کو ہم نے اوپر نقل کیا ہو :-

جس سے واضح ہے کہ ضعیفی سنی المذہب اور قادری المشرب تھے،

اصل متن کتاب اس طرح شروع ہوتا ہے، جس کے چھ بیت ہین، جن مین قارئین کو خاص نصیحت کی گئی ہے،

احد کا اوّل حمد سن کان دھر — بہی احمد کیر[1] کی نعت مین جان ورر

بزان[2] تون بیان کر نصیحت و پند — جو ہر یک کسی سے اوا وے پسند

اگر پند دینے منگے اے نول[3] — اودے پند تون آپنے کون اول

بزان آپنے اصل ہور خویش کون — یہی پند دے تیرے خیر اندیش کون

جو کوئی تجکون دلبند ہم یا رہے (رہنے) اچھے — تری عاقبت کے جو غمخوار اچھے

اسے پند دینا ہے دل جو سون — کہ تا اوملے آپنے پیو سون

بعض عنوانات اور احادیث نقل کرکے اوس کی تعبیر و تشریح بھی کی ہو، مثلاً

"یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِکَ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ" کی تشریح مین

اتیا میں کہون نیک ناری کو پند — ہے بی بی جو کوئی ست کی ساری کو بند

بولیا بول سن اے سہاگن سکی — اگر تون ہے گنونت بہا گن سکی

کہون مین تجے نیک بی بیان کے گن — تون دل جیو کے کان سوں خوب سن

اچھے تیرے اعضیان[4] مین گن نیک بد

جو رو گن تجے باند کر دیوں حدا

[1] کیرے = کی [2] بزان = بعد ازان [3] نول = نئی [4] اعضیان = (اعضا)

زبان کے گن:

اول گن زبان کا توسن گن بہری
سینگی تو بی بیان مین ہونگی کہری

بویان ہین جو کوئی پاک بی بیان اصیل
برا اُن کے مون مین نہین قال و قیل

نہ کچھ فسق کے بات اونین ذری
بچن مین نہ کچھ اون کے گالی بوری (بری)

نہ جھوٹا سخن مون مین لیاوین[1] اونو
نہ غیبت کدھیں[2] کرکے کہاوین اونو

نہ تہمت کسی پر رکھین[3] یک ذرا
نہ لیوین کدھیں کس اوپر افترا

نہ جھوٹی گواہی پو آوین کدہین،
نہ کچ جھوٹ سوگند کھاوین کدھین

نہ اونچا ہنسا[4] نا کرین مسخری
چھپا غیر سون رہین وسن مسکری

نہ گاوین کدہین گیت نہ کاڑین راگ
نہ کانین[5] کھیں رات کون بیٹ جاگ

نہ دیوین کدھیں مرد کون سخت جواب
ہے آتش اگر مرد تو ہو وین آب

مرد بہات ہر وقت میٹھا بچن
کرین ہور اچھین ایک (ایک) دل ایک من

اس کے بعد ازواج مطہرات کے ایلار کے واقعہ کو بطور تمثیل کے نقل کیا ہے، اور اس سے زبان کی تعریف و مذمت کا یہ نتیجہ نکالا ہے،

"نظم ایلا"

سنی تون یو اوس خاص بی بیاں کی بات
بچن تے انن پر سو کیون ہوئی تھی گھات

بچن کی یو کیسی ادائی دیکھے
پڑی تھی او کیسی جدائی دیکھے،

خدا باج کان اون کیتین کوئی ملائے
اتھے او جیہ خاصان گر وصل پائے

نہین تو او اپنے دھنی سون بچھڑ
رہے تھے او کیون بیوتے دور پڑ،

[1] لاوین، [2] کدھین = کبھی [3] لگاوین، [4] اونچا ہنسنا یعنی قہقہہ [5] کانیان یعنی کہانیان،

بچن کا سو تا ثیر کیوں ہے دیکھے،
بلایان بچن میں سوں کیوں ہے دیکھے

بچن کون تون سنبال سن اے سکی
بچن کون نکو گھال سن اے سکی

.. ..

بچن تے کسی وقت ہے نج شرف
بچن تے کسی وقت ہے ہر طرف

بچن تے کسی وقت مقبول ہوئے
بچن تے کسی وقت مقتول ہوئے

بچن نے کسی وقت پا دولتان
بچن تے کسی وقت کھاوے لتان (لات) الخ

آنکھ کی شرم:-

سنی بھاگ ونتی بچن کی تو بات
اپنا کون[1] تجھ سن نین کا نکات

جو کوئی بجھ ہے نیک زنیان[2] نے
حیا شرم ہے ان کے نینان نے

جو بائی[3] نیک بی بیان سو کرتیان جتن
بچن سوئی بچن ہور بچن سون نین

یو دونو کون بھوتیکہ[4] اک تو جھا نک
کہ بچنے[5] سون بات ہور بچن سون آنکھ

بچن ہور نین زن اوپر گھات ہے
جتن جن کرے اِن[6] بچن سات ہے

گنوائی نین ہور بچن کون جنے
گنوائی او سک[7] کے سجن کون ادنے

بچرط نیک ناری تو نیکی کے گن
نین کا بیان نیک نار بان تے سن

جو ہین نیک ناریان نین کے رتن
شو بکھاں[8] کے درجگ مین رکھیان جتن

رکھین شرم کے بھوین نے کا ڈکر
بجز یار دکھلاوس نا کاڑ کر،

اپن[9] بیچ میانے[10] سجن کون جو پائین
نین کے رتن ہنگ سجن کون دکھائین

[1] کون = رکھون، [2] زنیان یعنی زنان [3] بائی (عورت) [4] بہوتیکہ (بہت یک) [5] بچن (بات) [6] سک (سکھ چین) [7] پلکون کے [8] رکھتے ہین [9] اپن = اپنے [10] میانے = درمیان،

نین یو نہین ہے رتن اے سکی — اوسے غیر سون کر جتن اے سکی

زنان نیک ہے سو نین آپنے — وجیتیان[1] رہے غیر سوں جھانپنے

خطا سون نظر غیر پر جب کرین — تو شک دل میں لیا اس نظر سون پھرین

خدا ترس انکھیان رو لو کیاں سدا — خدا ترس انکھیان یو خوش ہے خدا

اسی واسطے نیک جایان[2] جنو[3] — اپن جیو مین بہو پایان جنو

انجو حق کیری خوف سوں جوش کر — انکھیان اس جہان سیتے (سے) سرپوش کر

رہین منتظر حق کے دیدار کیان — اچھین کر حلال آپنے یار کیان

اس ضمن مین بطور تمثیل ایک نیک بی بی کی عجیب و غریب حکایت نقل کی ہے، جس کو ہم بخوف طوالت قلم انداز کرتے ہین :۔

ضعیفی کی زبان مین وہی خصوصیات موجود ہین، جو اس کے معاصرین کی ہین البتہ بہ نسبت ہدایت ہندی کے جو فقہ کی کتاب ہے، اس کا انداز بیان دلکش اور شیرین ہے، ہندی الفاظ اور مرکبات بھی دلکش استعمال کئے ہین، جو دور حاضر مین بھی استعمال ہوتے ہین، مثلاً

ست کی ساری، گنونت، بھاگن، سہاگن، گن بھری، کھری، دہنی، بھاگ ونتی، روپ ونتی، سک (سکھ) کے سجن، نین کے رتن، نیک جائی، پاک جائی، نیک گن، بدگن، نرپتی، (لڑکا)

مروج کا املا مرویج، ایک کا املا ئیک، اور برائے تکمیل وزن شعر، فعل آکو آر، بیٹھ کا املا بیٹ، سنبھال کو سنبال، زن کی جمع زنیان وغیرہ،

حصر یا تاکید کے لئے بجائے ہی کے صرف چ استعمال کیا ہے، جو دکھنی خصوصیت ہے، ایک پوری

---

۱ جیتیاں، دیکھتی رہتی ہین کہ کہین غیر محرم پر نظر نہ پڑ جائے ۲ نیک جایان، نیک جائی، نیک لڑکیان ۳ جنو، جو،

غزل اسی ترکیب کی ہے، جس کو ہم آخر مین درج کرتے ہین، اس لحاظ سے ضعیفی کا شمار گیارہوین صدی ہجری کے دکھنی شعرا مین ہوتا ہے،

ہدایت ہندی مصنفہ ضعیفی کے ایک نسخہ مین جو حال ہی مین کتب خانہ آصفیہ مین داخل ہوا ہے، ضعیفی کی ہم کو حسن اتفاق سے کچھ غزلین دستیاب ہوئی ہین، چونکہ یہ نایاب ہین، اس لئے درج ذیل کرتے ہین تاکہ یہ محفوظ ہو جائین، ان کا رنگ مذہبی ہے، دیوان کے متعلق کوئی علم نہین ہوسکا،

سیوا سدا سبحان کا جیا ہے لگ کر ناچ ہے (دبی) — بندا یو بالغ ہوئے پر بندگی میں یگ دھرناچ ہے (بندہ یہ قدم ہی)

امید جینے کا پکڑ کب لگ رہیگا عیش مین — جیتا جیا بی ایک دن اس ٹھار سو مرناچ ہے (بھی ہی)

جیتا چہ ہے تج نین خبر او مرگ تیری موت کا — خنگل حیاتی کا سگل یکبار دو چہ ناچ ہے (حیات ہی)

آتا و جاتا ہے مگر اس دم کا ناکرا عتبار (دم) — جتنا بھریا ہوے گا بی آخر یو دم سرناچ ہے (تو بھی ہی)

دولت بغیر ایمان کون نین ہر قراری جان تون — امید اس کے لطف کا ہوا قہر سون ڈرناچ ہے (ہی)

اپنا کیا اپنے آنگے آدے سو ہرگز چوک[4] نین — کرتب کے اپنی بھیک سون گود اپنا بھرناچ ہے (ہی)

کر دست[1] انگے داتار کے مانگے ضعیفی بھیک تون — جن بھیک کون پایا پچھے جنت میں جا کرناچ ہے (ہی)

سچ اپنا کیا ہر سو وو اپنے ساتھ آدے گا — کمائی جو کیا ہر یان سو وان تون نقد پادیگا،

مکافات اپنے عملان (عمل) کا صبا[2] لینا چہ ہے حق کن[3] — لگا وے جاڑ تون جیسا تو پھل دیسا چہ کھادیگا

کہے ہین دار دنیا کون زراعت دین کا ہر کر — سچ وان کاٹ لیوے تون یہان جو بیج بھادیگا (بوئیگا)

کہین یعنی زراعت وہ جو عملان نیک دہرکے ہین — جزا سون یا سزا سون وان خالی کوئی جا دیگا

جزا سون نیک مومن کی خبر جنت کی دینا ہے — سزا سون کافر بد کون جہنم مین رکھا دیگا

اتیا اے بھائی سن میری غفل ایمان مین تیرے (اسقدر) — تل اتنا آن نادے وے نہ کی پھل پر گنوا دیگا

---

۱ یعنی ہاتھ اٹھا کر ۲ صبا، صبح ۳ حق کن (خدا کے پاس) ۴ بھول چوک،

اول ایمان لیا کر تون ضعیفی نیک عملان کر،
تو ہے امید تج اکثر خدا تے خیر با دیگا

یاری منے اوس یار بن دل کین ترا اٹکا نکو
او یار کی دنیا مین تون بل غیر پر ٹھکا نکو

دل باندنا کس غیر مین اکثر ترا جھٹ یو صحیح
دو دیس کے جینے مین تجھ جنجال کس جھٹکا نکو

لٹ پٹ ہوا ہے یون تجے وسواس اس خناس کا
باڑین اگر تج غیر پر تو ابسین ان جھٹکا نکو

ہرگز انا دل پر ترے چٹ غیر کی لگنے نہ دے
جس چٹ سون وان ہو خیال اس کی جٹکا نکو

دہر خیال حق کے یاد بن ہر دم ضعیفی نا بسر
تج دل کیرے حق یاد مین کس غیر کا ٹکا نکو

بخشش بغیر اللہ کن دنیا مین نا کچ منگ گو تون
ہو سبد کا صحبت چھوڑ تون نیکان ستی کر سنگ تون

اس سو تج ہو بد ہور نیک امر و نہی اسکا لیک
تون یان قضا کے باب مین ٹھیٹ ہو کر دنگ تون

اٹھ بیگ دل اب سات لا جا لا ہو ہت بگ تعلا
من نیک عملان مین چلا کوشش سون نا ہو تنگ تون

اس بعد جو تقدیر ہے، حق کا کیا اسپیر ہے
او اس رنگے تدبیر ہے کیا کر سکے یاں جنگ تون

ہو لگ سکت ہت پاؤن مین جا بیگ منزل ٹھان مین
میانے تو غیر ہے گا دن مین نا بیٹ ہو کر لنگ تون (درمیان غیر)

منزل مین دو مارگ سہج اخلاص ہو دوجا ریا
راہ ریا کون چھوڑ کر مخلص ہو چل یکر نگ تون

کرنا ضعیفی نیک سنگ ہوا حق ستی توفیق سنگ
سیک دنبدن کچ خوب ڈھنگ سیکھیا کیا بد ڈھنگ تون

دنیاں کی گردیں جا بیٹھیا تون ہو کے پسر کا
ٹنکا کیا ہے دلکون فانی کی بسر کا

دنیا نخی دیگ فانی جیسا جگر ہو پانی
سنبال کر اپسکو چھیڑ دیں کانوں کپر کا

---

۱ کین، ۲ دو دیس = (دو دن)، ۳ باڑ مین (یا اڑین)، ۴ جھٹکا نکو = تھٹک مت، ۵ بیگ = جلدی، ۶ ہت بگ = ہاتھ پاؤن، ۷ دوجا (دوسرا)

۸ پسر کا = بیٹھا ہو کر، ۹ ٹنکا = دانہ، ۱۰ جگر = کیچڑ، ۱۱ سنبال = سنبھل کر، ۱۲ کپر کا = کنارہ (حدر تکبیر ڈکشنری)

دنیا تجے مین عمل سون حاصل یو دین کرنا
ہور یاد مین دھرنا بیکا دنیا کا روپ کا،

کر مال کن دنیاں کا کاٹیا تن کے سو گھر مین
آخر اسے قبر مین ہے آگ کا بھبڑ کا

دنیان یو کا فران کون ہو شہد سون بی نا تھی
مومن کے حق مین جون ہی نیم کے سو جڑ کا

دنیا مجھی کے تین تون بگلا گیا ہو جینے
ہو لیا جنگل کے تج سین ہو سوت کی لگڑا

جو کوئی جڑیا ہو تس سون دنیا کا یو دلارا
جھولا اُسے ہو آخر جن سے اپسکون پر کا

کیا چہر نمن لیا یو حرص و طمع تیرے دل گا
لگا ہو درد مرجون برسانت کے سو جھڑ کا (برسات)

بھڑ اوڑ نا ضعیفی سے دین کی دولائی
دنیا کی ٹھنڈ کھا کھا گیا تن کیا مدرکا

دنیا کے تون منزل منے غفلت سون پڑ کر سو نکو
یو نقد تیری راہ کا رو ٹی مین بجا نبد ھو نکو

نفس امارہ چور لگ جیتا پھرے رو ٹی پدل
رو ٹی برابر خرچ تج حب الوطن کا کھو نکو

طمع دریا طول عمل یو رہزنان تج راہ کے
انکے جھڑپ مین تون سپڑا ابسین نکالی او نکو

لہو و لعب کینہ غضب تج راہ کے غولان مین یو (دیو)
کھانا فریب وان بات جا مل انسو کر گفتگو نکو

تون صدق ہور اخلاص کے مارگ پہ دھر ثابت قدم
کج مو نکل آڑا تیرا خوش خلق ہو بد خو نکو

بد خوئی کا یو بوج تج باندہ کر یگا راہ مین
یو بوج غیری لے عبث گردن پہ اپنے ڈھو نکو

حق راہ کون تون توں یو بچ نے کر نا یقین کون پیشوا
ہوا اس انگے کس غیر کا ان مان جبت جو نکو

جانے منگے اس راہ کر سا نچے مرید اے طالبان
تو پاؤ لغزش ہو ریا اخلاص سون بہلو نکو

اب آپنے کون ایک جان دین محمد کون پچھان
تب پونچیا اس رہ بگیان وا ایک دل ہو ڈھو نکو

بولا ضعیفی حال نیز گذری عمر تو ہوئی نہ چیز
اب رہی سو عمر کے عزیز غفلت سو گذرا نو نکو

---

۱ سوت کی لگڑا = سوت کی ڈوری جس سے مچھلی کا شکار کرتے ہین یعنی گل، ۲ روٹی = اور ن ۳ طول امل۔

"پھر وہی نشاطِ رفتہ"!

از

نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی

مارچ ۵۳ء کے رسالہ نگار، لکھنؤ میں ڈاکٹر عندلیب شادانی کے مجموعۂ کلام نشاطِ رفتہ پر میری تنقید شائع ہوئی تھی، نومبر اور دسمبر ۵۲ء کے رسالہ معارف اعظم گڑھ میں پروفیسر عطاء الرحمٰن کاکوی نے اس کا جائزہ لیا ہے،

پروفیسر صاحب کو میری تنقید میں جو چیز نمایاں طور پر کھٹکی وہ شادانی صاحب کے کلام پر "جا بجا ذیکا اصلاحیں ہیں"، وہ میرے اس فعل کو بڑی خطرناک قسم کی رسم سے منسوب کرتے ہیں، اور اس کا منشا یہ قرار دیتے ہیں کہ میں اپنی شاعرانہ عظمت منوانا چاہتا ہوں، میں آج تک اس غلط فہمی میں مبتلا تھا، کہ شاعری اور نقد شعر دو مختلف چیزیں ہیں، اور اگر (بدقسمتی سے) کسی میں یہ دونوں باتیں جمع بھی ہو جائیں، تو شاعرانہ عظمت کا دار و مدار کلام پر ہوگا، نہ کہ انتقاد پر، ورنہ خانِ آرزو جنھوں نے شیخ علی حزیں کے اشعار پر اعتراض کئے اور اصلاحیں دیں، حزیںؔ سے بہتر شاعر مانے جاتے، پھر فرماتے ہیں کہ "یہ رسم پھیلی تو لوگ میرؔ اور غالبؔ کے کلام پر بھی اصلاحیں دینا شروع کریں گے، بالفرض ایسا ہوا تو یہ خطرناک اقدام کیوں ہوگا، میرؔ نے اپنے بعض معاصرین کے کلام پر اصلاح دی، میر حسنؔ نے اختلاف کیا، اس سے میرؔ یا میر حسنؔ کی شاعرانہ عظمت میں کیا اضافہ یا نقصان ہوا، سوداؔ اس معاملے میں سب سے پیش پیش تھے، تو کیا اس بنا پر اس کی شاعرانہ شہرت کو چار چاند لگ گئے، غالبؔ بھی نکتہ چینی سے محفوظ نہ رہے، چنانچہ یادگارِ غالبؔ میں ہے:-

"مرزا کے کلام پر اگر کوئی ٹھیک اعتراض کرتا، یا کوئی عمدہ تصرف اُن کے شعر میں کرتا تھا تو اُس کو فوراً تسلیم کر لیتے تھے۔"

مغربی ادب میں بھی اس نقد و تصرف کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں، شاعر اگر نقاد بھی ہے، تو اُس کی دونوں صلاحیتوں کو خلط ملط کیوں کیجئے، حاشا اگر کسی کے شعر پر اعتراض کرنے یا بدل تجویز کرنے سے میرا منشا زبان کی خدمت کے سوا اور کچھ ہو، ترمیم پیش کرنے سے صاحبِ شعر کو غور کرنے کا موقع ملتا ہے، اگر اعتراض یا ترمیم معقول ہے، تو قبول کر سکتا ہے، ورنہ اپنے شعر کی صحت کے متعلق اس کی رائے اور مستحکم ہو جائے گی، پڑھنے والوں کو بھی کلام کے پرکھنے، الفاظ کے نازک فرقِ مفاہیم اور برمحل استعمال، محاورات کے صحیح یا غلط صرف کے جانچنے کا شوق پیدا ہوگا، خود پروفیسر صاحب کا مضمون اس کا شاہد عادل ہے،

انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے، کہ میرؔ و غالبؔ کے کلام میں اصلاح کی بہت گنجائش ہے"، کیا اچھا ہو کہ ان باکمالوں کے پورے کلام کو نہیں تو چند غزلوں کو اُن کے عہد کی زبان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اصلاح سے مزین کرنے کی کوشش کریں، یہ کام خطرناک کیسا بہت مفید اور دلچسپ ہوگا، ہاں ایک اندیشہ ہے، اگر اعتراضات جچے تلے نہ ہوئے، یا اصلاح اٹکل پچو ہوئی تو پروفیسر صاحب کا مذاقِ شعر فہمی و سخن سنجی مطعون ہو جائے گا،

اُن کا یہ بھی ادعا ہے کہ میں نے کلامِ شادانی کے ادوار قائم کرنے میں زیادتی سے کام لیا ہے مگر اس الزام یا اتہام کی تائید میں ایک لفظ بھی سپرد قلم نہیں کیا، خود شادانی صاحب نے اپنے کلام کے دو ادوار قائم کئے ہیں، پہلا دور ۲۳ء سے، اگست ۲۹ء تک، دوسرا جولائی ۳۲ء سے تا اشاعتِ کلام، درمیان میں پانچ سال کا وقفہ بجز ایک نظم کے خاموش ہے، میری جو کچھ زیادتی ہے، یہ ہے کہ اس وقفہ کو بھی ایک نام دیدیا خاموش ماتم نشاطِ رفتہ" یا "دورِ انقباض و دل گرفتگی" اور یہ بھی لکھ دیا تھا کہ سرچشمۂ الہام کے عارضی طور پر خشک ہو جانے کا جوگ اور شاعروں پر بھی پڑا ہے،

پروفیسر صاحب کو تسلیم ہے کہ غزل میں معشوق کے لئے ضمیر مؤنث کا استعمال مستحسن نہیں، اور

شادانی صاحب اس بدعت کے مرتکب ہوئے ہیں، تاہم فرماتے ہیں کہ مجھے اس پر ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع مل گیا، یہ فائدہ اگر اس اختلافِ ضمیر کی طرف توجہ دلانے کو کہ کبھی معشوق کو مذکر اور کبھی مؤنث ضمیر سے مخاطب کرتے ہیں، فائدہ اٹھانے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، ناجائز کیونکر ہوا، جب خود پروفیسر صاحب ایسے ناہموار استعمالِ ضمیر کے مؤید نہیں،

اگر میں شادانی صاحب کی بعض نظموں کی تعریف کرتا ہوں، اور بقول پروفیسر صاحب دل کھول کر تعریف کرتا ہوں تو اس سے بھی اُن کو بوئے استہزا آتی ہے، مگر تحریر نہیں فرماتے، کہ میرے کن الفاظ سے استہزا کی بوئے ناخوش گوار نکل کر پراگندگیٔ شامہ کا موجب ہوئی،

پروفیسر صاحب نے میری یہ عبارت نقل کرنے کے بعد کہ مجھے نشاطِ رفتہ میں زبان و بیان کی خامیاں اور تخئیل کی کمزوریاں بھی نظر آئیں، یہ شعر درج کیا ہے؛

سُنا ہو تم نے شاید میرے ہمسایوں میں چرچا ہے — کہ اکثر رات کو رونے کی اک آواز آتی ہے

حالانکہ یہ شعر اور اسی قبیل کے دیگر اشعار نگار کے ص ۴۹ پر اس عبارت کے ذیل میں درج ہیں:

"اگر یہ تقسیم درست ہے، تو پہلے دور کی شاعری کو یکسر نغمۂ شادی اور دوسرے دور کی شاعری کو یکسر نوحۂ غم ہونا چاہیے، مگر ایسا نہیں ہے، اور اُن کا (شادانی صاحب کا) فرمانا کہ اُن کی شاعری تمامتر حالی ہے، اور انھوں نے زندگی میں ایک شعر بھی ایسا نہیں کہا جس پر آپ بیتی کا اطلاق ہو سکے، بہت کچھ ترمیم کا محتاج ہو جاتا ہے، کیونکہ دورِ نشاط و کامرانی میں بھی اُن کے قلم سے حزنیہ اشعار زیادہ تر درد انگیز ہی نکلے ہیں، جس طرح خیالی مضامین کو حالیہ نہیں کہا جا سکتا، عہدِ طرب میں المیہ شاعری حالیہ نہیں ہو سکتی، دورِ اوّل کے بعض اشعار مثالاً پیش کئے جاتے ہیں،

سُنا ہو تم نے شاید میرے ہمسایوں میں چرچا ہے — کہ اکثر رات کو رونے کی اک آواز آتی ہے"

حیرت کیوں نہ ہو جب پروفیسر صاحب فرمائیں کہ میں نے یہ شعر زبان و بیان کی خامی دکھانے کو درج کیا، اس نہج کے اشعار کا سلسلہ نگار کے ص ۴۲ سے شروع ہوتا ہے، اور اس کی تمہید ہے کہ

"مجھے نشاطِ رفتہ میں زبان کی خامیاں اور تخئیل کی کمزوریاں بھی نظر آئیں بعض کی طرف اشارہ کرتا ہوں"

ان اشعار کا سلسلہ اس شعر سے شروع ہوا ہے،

حُسنِ حجاب کوش فریبِ نظر سہی — رعنائی خیال کا سامان ہو گیا

پروفیسر صاحب نے ص ۴۲ کی عبارت کو ص ۴۹ پر منتقل کر دیا، اور میری بحث کی نوعیت بدل دی، انھوں نے ایسا کیوں کیا وہی بتا سکتے ہیں،

میں نے شعر زیرِ نظر (سنا ہو تم نے شاید الخ) کے متعلق یہ عرض کیا تھا کہ اس سے قطع نظر کہ مضمون پامال و فرسودہ ہے کون باور کرے گا، کہ ڈاکٹر صاحب راتوں کو اس شور سے روتے تھے کہ ہمسایوں کی نیند حرام ہی نہیں ہوتی تھی، بلکہ اس گریۂ شبگیر کا اس قدر چرچا تھا کہ معشوق کو بھی اطلاع ہونا ممکن ہو گیا"،

ظاہر ہے کہ میں نے یہ شعر اور ایسے ہی دوسرے اشعار شادانی صاحب کے اس قول کی تردید میں پیش کئے تھے، کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں، قال نہیں، بلکہ تمامتر حال ہوتا ہے، چنانچہ اس کے فوراً ہی بعد یہ شعر تھا،

پسِ دیوار تڑپنے میں لہو رونے میں — ایک لذت ہے کوئی ہو کہ سرِ بام نہ ہو

اور دریافت کیا تھا کہ کیا ڈاکٹر صاحب کو در اصل یہ سانحہ پیش آیا ہے کہ معشوق کے پسِ دیوار تڑپے اور لہو روئے ہیں،

پروفیسر صاحب نے اس دھن میں کہ میرے اس دعوے کو غلط ثابت کریں کہ شعر (سُنا ہو تم نے شاید الخ) کا مضمون پامال و فرسودہ ہے، اس کو عجیب و غریب معنی پہنائے ہیں، فرماتے ہیں،

"رونے میں نہ شور ہے نہ ہنگامہ ہے، بلکہ ایک آواز آتی ہے"، میں کتنی نرمی ہے، ہمسایوں میں

کانون کان خبر ہوتی ہے، اس کا چرچا ہوتا ہے، اس لئے شاید کا لفظ کتنا بلیغ رکھا ہے"

اس سے قطع نظر کہ کانون کان خبر ہونا مہمل و بے معنی فقرہ ہے، کیونکہ محاورہ کانون کان خبر نہ ہونا
ہے، جو ہمیشہ نفی مین استعمال ہوتا ہے، یہ عجیب دھم سرون مین رونا ہے کہ ہمسایون کو خبر بھی ہو جاتی ہے،
اس کا چرچا بھی ہوتا ہے، اور یہان تک ہوتا ہے، کہ قائلِ شعر کو بھی علم ہو جاتا ہے، اور معشوق سے کہتا ہے
کہ تم نے بھی شاید سُنا ہو، شادانی صاحب رونے کی آواز کہتے ہین، پروفیسر صاحب رونے کو خارج کرکے خالی
آواز رکھتے اور اُس مین نرمی پیدا کرتے ہین، اور اس سے قطعاً خالی الذہن ہو جاتے ہین، کہ یہ رونا کم سے کم اتنی
بلند آواز سے تو ضرور ہے کہ ہمسایون کے کانون تک پہنچتا ہے۔

پروفیسر صاحب کا ایک اور فعل وضاحت طلب ہے، انھون نے میرے بعض اعتراضات ادھورے
نقل کئے ہین، اور بعض مجوزہ ترمیمات شعری درج کرنے سے اجتناب کیا ہے، یہ کیون،؟ مثلاً شادانی صاحب
کے اس شعر مین

حسنِ حجاب کوش فریبِ نظر سہی — رعنائی خیال کا سامان ہوگیا

مین نے مصرعِ اولیٰ یون تجویز کیا تھا ع

"حسنِ حجاب کوش کو دیکھا کہان، مگر"

پروفیسر صاحب نے اسے نقل نہین کیا ورنہ فریبِ نظر کا ابہام کھُل جاتا، انھون نے میرا پورا اعتراض
بھی نقل نہین کیا،

شادانی صاحب کا شعر ہے:

مین جب یہ سوچتا ہون کہ تم سے جدا ہون مین — پھرون یہ سوچتا ہون کہ کیا سوچتا ہون مین

میری عبارت یہ ہے:-

"سوچنا اور سوچنے کے درمیان سوچنا کہ کیا سوچتا ہون، تاہم احساسِ جُدائی نفسیات

کے کسی اصول کے مطابق نہین، تصور کی محویت اور محویت کی صورت گری کا کرشمہ یون
دکھایا جا سکتا ہے ع

تم جیسے یہ پوچھتے ہو کہ کیا سوچتا ہون مین

اب ملاحظہ فرمائیے کہ پروفیسر صاحب میرا اعتراض کیونکر نقل کرتے ہین:-

"سوچنا اور سوچنے کے درمیان یہ سوچنا کہ کیا سوچتا ہون نفسیات کے کسی اصول کے مطابق نہین"

انھون نے میری مجوزہ ترمیم بھی درج نہین کی، میری عبارت کے بیچ سے "تاہم احساسِ جدائی" کے ٹکڑے
کا حذف تو بہت ہی معنی خیز ہے کیونکہ وہ پروفیسر صاحب کے جواب مین ضم ہوگیا ہے، اُن کی عبارت ہے:-

"تعجب ہے کہ ایک اچھے شعر کو ہدفِ اعتراض بنایا جائے، خوبی تو اسی مین ہے کہ عاشق
کو خود ہی یہ سوچ ہوتی ہے، کہ مین یہ کیا سوچ رہا ہون، اگر تم سے جدا ہون، تم سے اور
احساسِ جدائی"۔؟

انصاف سے کہئے کہ پروفیسر صاحب کا بیان کردہ مطلب میرے ترمیم شدہ شعر سے نکلتا ہے یا اصل شعر سے،
یہ بھی توجہ دلا دون کہ "نشاطِ رفتہ" اور "نگار" مین سوچنا کا املا ہر جگہ بلا نون غنہ ہے، اور پروفیسر صاحب نے
ہر جگہ نونِ غنہ کا اضافہ کیا ہے،

شادانی صاحب کا شعر ہے:-

یاد آتی ہے جو مرحوم تمناؤن کی — بھول جاتا ہون کہ محروم تمنا ہون مین

پروفیسر صاحب نے میرا اعتراض اس طرح نقل کیا،

"مرحوم تمناؤن کی جگہ خون گشتہ تمناؤن بہتر ہوتا،"

اور فرمایا کہ:-

"میرے خیال مین دونون مساوی ہین، مرحوم اور محروم مین جو لطفِ تجنیس ہے، اس سے بھی

یہ شعر محروم ہو جائے گا"

حالانکہ میرے اعتراض مشمولۂ نگار کی ابتدا ہی ان الفاظ سے ہوتی ہے :-

"مرحوم و محروم کی تجنیس و ترصیع اگر نظر انداز کر دیجئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

شادانی صاحب کا شعر ہے :-

کاش مجھے بید دیجھ کر مجھ سے انھین نفرت ہو جائے ان کا اندوہِ ناکامی اور بھی کھائے جاتا ہے"

اس پر میرے اعتراض کو پروفیسر صاحب نے اس طرح درج کیا ہے :-

"معشوق کو اندوہِ ناکامی سے متہم کرنا حد درجہ ابتذال ہے"

اصلاح :- اُن کے نازک دل کا دکھنا اور بھی کھائے جاتا ہے"

پروفیسر صاحب کا جواب ہے کہ اس شعر کو ابتذال سے منسوب کرنا خود اپنے تخیل کی بے راہ روی ہے ، عاشق کو یہ گوارا نہین کہ معشوق اس کا غم کھائے ، اس لئے وہ تمنا کرتا ہے کہ میری ذات سے اُس کو نفرت ہو جائے تاکہ اس کو سکون ہو ،

میرے عائد کردہ اعتراض کی پوری عبارت یہ ہے :-

"عاشق اگر شاعر بھی ہے ، تو معشوق کو "اندوہِ ناکامی" سے متہم کرنا حد درجہ کا ابتذال ہے ، ایسے اشعار کہنے کے لئے بڑا سلیقہ درکار ہے ، ایک اسلوب یہ ہو سکتا تھا :

"اُن کے نازک دل کا دکھنا اور بھی کھائے جاتا ہے"

کوئی پروفیسر صاحب سے پوچھے کہ اندوہِ ناکامی محض غم ہے یا ناکام رہنے کا غم ہے ، کیا معشوق کو ناکام رہنے کا غم ہونا اس کا غماز نہین کہ عاشق کے وصل سے بر و مند نہ ہوا ، اور اس کو عاشق سے محبت تھی ، کیا نفرت ہو جانے مین یہ اشارہ نہین کہ اب تک اُسے عاشق سے محبت ہے ، مین نے پیشتر کی عبارت مین اسی مذموم پہلو کو "ابتذال اور سلیقہ درکار ہے" الفاظ سے پردے پردے مین بیان کیا تھا ، پروفیسر صاحب نے

جب اس کو میرے تخیل کی بے راہ روی پر محمول کیا تو مجبوراً شرح کرنی پڑی ،

شادانی صاحب کا شعر ہے ،

ترے لطفِ بے کران نے مجھے عمر بھر رلایا کہون کس طرح کہ مین نے صلۂ وفا نہ پایا

پروفیسر صاحب نے میرے اعتراض کا صرف ایک جزو وہ بھی ادھورا نقل کیا ، باقی کی خانہ پُری وغیرہ وغیرہ سے کر دی ، اس طرح : "اُس کو حقیقی شاعری سے کوئی لگاؤ نہین ، معشوق کے لطفِ بے کران نے رُلایا کیون ، پھر اسی کو آپ صلۂ وفا سمجھتے ہین" وغیرہ وغیرہ کی جگہ یہ الفاظ ہین "یعنی آپ کو وفا کا اور کوئی صلہ ملا ، تو پھر لطفِ بے کراں کی گنجایش کہان"

رُلایا کے قبل مین نے اصل شعر کی مطابقت مین "عمر بھر" لکھا تھا ، پروفیسر صاحب نے اُس کو حذف کر دیا ،

اب ملاحظہ کیجئے کہ پروفیسر صاحب شعر کے کیا معنی بیان کرتے ہین ، "شعر کا مفہوم یہ ہے کہ صلۂ وفا ملا ، اور خوب ملا ، اسی کا تو رونا ہے ، کاش تو بے وفا ہوتا ، لطفِ بے کران نہ کرتا ، تو پھر یہ اذیت کیون ہوتی ، شادانی صاحب کے ایک دوسرے شعر سے اس کی وضاحت ہو جائے گی ،

رات اک بزم مین تھے جور و جفا کے شکوے دل بھر آیا جو تری مہر و وفا یاد آئی

ع :- "کہون کس طرح کہ مین نے صلۂ وفا نہ پایا"

کے یہ معنی لینا کہ صلۂ وفا ملا اور خوب ملا ، پھر خاطر خواہ صلۂ وفا ملنے کا رونا رونا ، وہ بھی عمر بھر ، نغز گفتاری ہو تو ہو ، شعر کے مفہوم سے اُسے کوئی علاقہ نہین ، میرا اعتراض بدستور قائم ہے ،

شادانی صاحب کا شعر ہے

حُسن کی تکمیل ممکن ہو تو بتلاؤن تجھے ہم نشین وہ کچھ ادائین تھین جو دل کو بھا گئین

مین نے "کچھ ادائین" کی جگہ "کیا ادائین" تجویز کیا تھا ، پروفیسر صاحب کا جواب جہان تک مجھ سے

متعلق ہے، یہ ہو کہ

"اعتراض اس لئے غلط ہے کہ شاعر کہتا ہے کہ کون سی ادائین تھین جو بھا گئین، اس کا بتانا اسی وقت ممکن ہو جب حُسن کی تحسین کی جائے یعنی اُس کا تجزیہ کیا جائے"،

کیا پروفیسر صاحب کے الفاظ "کون سی ادائین"، میرے مجوزہ "کیا ادائین" کی بدلی ہوئی شکل نہین ہی، "کچھ ادائین" کا مفہوم ہے کہ ادائین معلوم ہین، مگر ان کا بیان کرنا، یا اُن کی شرح منظور نہین، ایسی صورت مین تحلیل یا تجزیۂ حسن کا سوال ہی پیدا نہین ہوتا، "کیا ادائین" کا یہ مطلب ہوا کہ اداؤن کی نوعیت متعین نہین کی جا سکتی، ممکن ہو کہ تجزیۂ حُسن سے یہ معمّا حل ہو، عجب نہین کہ شعر کہتے وقت شادانی صاحب کے تحت الشعور مین حافظ کا یہ مصرع ایوانِ شعور مین داخل ہونے کو مچل رہا ہو،

ع "بسیار شیوہ ہاست بتان را کہ نام نیست

شادانی صاحب کا شعر ہے،

تم سے کیا چھوٹے کہ دل کے ولولے ہی مٹ گئے

آرزوئین چند کلیان تھیں کہ جو مرجھا گئین

میرا اعتراض تھا کہ جو مین کہ "یا جو" زائد ہے اور یہ ترمیم پیش کی تھی :

ع :۔ آرزوئین چند کلیان تھین کھلیں، مرجھا گئین

پروفیسر صاحب تسلیم کرتے ہین کہ جو یقیناً سماعت پر بار ہے، مگر اس عیب سے کوئی شاعر نہ بچ سکا، اگر عیب کی پیروی حسن ہے تو مجھے کچھ کہنا نہین بجز اس کے کہ عیب دور ہو سکتا ہے تو اُسے کیون گوارا کیا جائے، میرا مجوزہ مصرع شاید مقصد پورا کر دیتا ہے، مگر پروفیسر صاحب اسے قابلِ اعتنا نہ سمجھے،

شادانی صاحب کا شعر ہے،

دلوں مین جوششِ نشاط ہو عجب امنگ ہو | یہ نشۂ وفورِ انبساط کی ترنگ ہے

پروفیسر صاحب میری عبارت درج کئے بغیر فرماتے ہین کہ "ہو" کی جگہ یقینی "ہے" ہونا چاہیئے، اثر صاحب کو اتنا بھی بدگمان نہ ہونا چاہیئے، حالانکہ مین نے خود تحریر کر دیا تھا، کہ ممکن ہو "ہو" کی جگہ "ہے" ہو، مگر پروفیسر صاحب اس لئے کہ مجھکو بدگمان ٹھہرائین، میری عبارت نقل نہین کرتے،

شادانی صاحب کا مصرع ہے :

ع "سادہ بیاضِ گردن اک خندۂ سحر ہے"،

میرا اعتراض تھا کہ سادہ بیاضِ گردن کو خندۂ سحر سے تشبیہ دینا تخیّل کی بے راہ روی ہے، خندۂ سحر سے شگفتگی و رنگینی کا خیال علٰحدہ نہین کیا جا سکتا، گردن مین صرف سپیدی ہوتی ہے، جسے ان کیفیتون سے کوئی ربط نہین،

پروفیسر صاحب جواب دیتے ہین کہ بیاضِ گردن کو خندۂ سحر سے تشبیہ دینا اگر تخیّل کی بے راہ روی ہو تو آتش بھی اُس کے مجرم تھے، انھون نے کہا ہو :۔

بیاضِ گردنِ جانان کو صبح کہتے جو ہم | ستارۂ سحری تکمۂ گلو کرتے

خطا معاف پروفیسر صاحب خندۂ سحر محض سحر نہین ہے، بلکہ طلوعِ سحر ہے، یہ وہ وقت ہے جب آفتاب نکلنے کو ہوتا ہے، اور مشرق مین شفق پھوٹتی ہے، آتش کے شعر مین صرف لفظ صبح ہے، نہ کہ طلوعِ صبح، ستارۂ سحری لانے سے واضح ہے کہ اُس نے صبح کی وہ ساعت انتخاب کی ہو جسے تڑکا، یا پو پھٹنا، صبح کا عنقا یا خطِ ابیض کا نمودار ہونا کہتے ہین، جس مین نام کو بھی سُرخی نہین ہوتی، بیاض کے معنی ہی سپیدی کے ہین، اور بیاضِ گردن سپیدیِ گردن کے سوا کچھ نہین، انشاء کا شعر ہے ؎

خدام ناصیہ سا ہیں حضور مین تیرے | سوادِ چشمِ شب و گردنِ سحر کی بیاض

انھی وجوہ سے مین نے مصرع کی یہ ترمیم تجویز کی تھی :۔

ع "سادہ بیاضِ گردن اک سیمگون سحر ہے"

شادانی صاحب کا شعر ہے:

شبہائے تار و تنہا با کار کر رہی ہوں　　اک موتیوں کی مالا تیار کر رہی ہون

مصرع اولیٰ کی میں نے یہ صورت تجویز کی تھی،

ع شب ہائے تار و تنہا ضو بار کر رہی ہون

اس طرح مصرع ثانی مین موتیون کی مالا (آنسوؤن کی لڑی) سے ایک ربط پیدا ہوجاتا، پروفیسر صاحب نے میرا پورا اعتراض درج کرنے کے بجائے صرف یہ ٹکڑا لے لیا کہ "باکار کا تنہا استعمال اردو مین فصیح نہین"، اس سے انحراف ممکن نہ ہوا تو کہہ دیا کہ بیکار اگر فصیح ہے تو باکار غیر فصیح کیون ہو، کثرتِ استعمال سے، یہ بھی ویسا ہی باکار ہوجائے گا، جیسے بیکار،

غیر فصیح الفاظ استعمال کیجئے، اور توقع رکھئے کہ کثرتِ استعمال سے فصیح ہوجائیں گے، اگر یہ زبان کی خدمت ہے تو زبان کی مٹی پلید کرنا کسے کہتے ہین:-

نومبر کے معارف مین تین اشعار ایسے ہین، جن پر میرے اعتراضات مین کوئی تحریف یا تخفیف نہین کی گئی، اب اُن جوابات کا جائزہ لیتا ہون،

نیم نگاہ دے گئی دل کو فریب التفات　　نقشِ امید اُبھر گیا، صبر کا حوصلہ ہوا

میرا اعتراض تھا کہ صحیح زبان نقشِ امید ابھرا ہے، نہ کہ اُبھر گیا، پروفیسر صاحب کے خیال مین "دے گئی" کی مناسبت سے اُبھر گیا بہتر ہے، ایک جواب تو یہ ہے کہ اگر ابھر گیا بہتر ہے تو حوصلہ ہوا سے "حوصلہ ہوگیا" بہتر ہے نہ کہ حوصلہ ہوا، علاوہ برین اس شعر کی نثر سے "اُبھر گیا" کی مہملیت آئینہ ہوجاتی ہے: نیم نگاہ دل کو فریب التفات دے گئی، (جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ) نقشِ امید اُبھرا (اور) صبر کا حوصلہ ہوا،

مایوس تمنا کی اللہ رے بیتابی　　رونے سے بھی اب دل کو تسکین نہین ہوتی

میرا اعتراض تھا کہ عالم یاس مین بیتابی کہان، مایوس کی جگہ برباد پڑھئے، پروفیسر صاحب تسلیم کرتے

ہین، کہ مایوس سے برباد بہتر ہے، میری ترمیم اس دعوے کی تابع تھی، کہ مایوسی مین بیتابی نہین ہوتی، لفظ برباد کو ترجیح دینے کے بعد بھی فرماتے ہین، کہ بیتابی مین اگر گھبراہٹ بھی شامل ہے تو داغ کا یہ شعر سنئے:

عالم یاس مین گھبرائے نہ انسان بہت　　دل سلامت ہے تو حسرت بہت ارمان بہت

پروفیسر صاحب کو خود بھی اعتماد نہین کہ بیتابی مین گھبراہٹ شامل ہے، ورنہ لفظ اگر سے مشروط نہ کرتے، داغ کے مطلع مین گھبرانا پریشان ہونا ہے، نہ کہ بیتاب ہونا، بقول خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ:- "بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا"،

نہ سنو قصۂ ناکامِ محبت نہ سنو　　یہ ہے وہ خواب کہ جسکی کوئی تعبیر نہین

میرا اعتراض تھا کہ دونون مصرعے نامربوط ہین، ناکامیِ محبت کو قصہ کہکر خواب کہنا غلط اور جب خواب نہین تو تعبیر کا سوال پیدا نہین ہوتا، پروفیسر صاحب کا جواب ہے کہ کسی ناکام محبت کا قصہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی خواب جو شرمندۂ تعبیر نہ ہو.

یہ مانتے ہوئے بھی کہ قصے کو خواب کہہ سکتے ہین خواب کی تعبیر ناکامی موجود ہے، خواب شرمندۂ تعبیر ہوگیا اور یہ کہنے کی گنجایش نہ رہی کہ اس خواب کی کوئی تعبیر نہین، کسی قدیم شاعر کا مطلع ہے،

سرگزشتِ بلاکشان نہ سنو　　نہ سنو میری داستان نہ سنو

پروفیسر صاحب کا مضمون نومبر کے معارف مین اس شعر پر ختم ہوتا ہے،

یکسان موسم یکسان راتین بادو باران ہین،

سونے والے سوتے ہین اور رونے والے روتے ہین

یہان تک مادیح کے نگار مین اُن اشعار کی تعداد اٹھائیس ہے جن پر مین نے ایراد کیا ہے، پروفیسر صاحب نے اُن مین سے صرف اکیس پر جواب مین قلم اٹھایا ہے[1] سات کو نہ تو چھوا نہ اُن کا تذکرہ کیا، ایسی

[1] معارف:- پروفیسر صاحب نے اثر صاحب کے بعض اور اعتراضات کے جواب بھی دیئے تھے، جن کی صحیح تعداد

ہین سے نو اشعار پر میرے اعتراضات کو کُلاً یا جزواً تسلیم کر لیا، کیا مین حق بجانب نہ ہون گا اگر یہ نتیجہ نکالون کہ اُن سات اشعار پر بھی میرے اعتراضات کو صحیح مان لیا گیا، مگر تسلیم شدہ اعتراضات کی تعداد گھٹانے کو انھین شامل نہین کیا گیا، وہ سات شعر جو پروفیسر صاحب نے اپنے جائزے سے خارج کر دیئے یہ ہین:

۱۔ مٹ گئی وہ بھی جو باقی تھی امید موہوم — خود فریبی کی بھی اب تو کوئی امید نہین

۲۔ تو ہے مجبور، تمنائے وفا رنج نہ دے — آہ کرتا ہون مگر خواہشِ تاثیر نہین

۳۔ شبابِ حُسن کی رعنائیان مٹا دینگی — برائے نام جو احساسِ ننگ باقی ہے

۴۔ کرون جو مین گلۂ ہجر نا سپاس نہین — یہ کم ہے کیا کہ تری یاد مین گزرتی ہے

۵۔ ہائے وہ حال کہ جب درد سے جی بھر آئے — اور یہ ڈر بھی ہو کہ یا رب کوئی بدنام نہ ہو

۶۔ ہو کے مایوس بھی ہم جیتے ہین ہان جیتے ہین — وائے وہ زیست اجل پر بھی جسے ناز نہ ہو

۷۔ کہین اُگی ہے ضیمران کہین کھلی ہے چاندنی — کسی طرف ہے نازبو کسی طرف ہے جعفری

لہٰذا اٹھائیس مین صرف بارہ اعتراضات ایسے ہین جن کے بارہ مین پروفیسر صاحب کو مجھ سے اختلاف ہے،

شادانی صاحب کے اشعار کی مجموعی تعداد جن پر مین نے اعتراض کیا انسٹھ ہے، دسمبر کے معارف مین نگار کے باقی ماندہ اکتیس اشعار مین سے پروفیسر صاحب نے صرف بائیس پر قلم اٹھایا ہے، ان مین سے گیارہ پر میرے اعتراضات کو تسلیم کر لیا ہے، گیارہ مین اختلاف کیا ہے، نو اشعار کے متعلق نومبر کے معارف کی طرح موافقت یا مخالفت مین کچھ لکھنا کیسا اُن کا ذکر ہی نہین کیا، مین دوبارہ اپنے شبہ کا اظہار کرتا ہون کہ اس پردے مین قابلِ تسلیم اعتراضات کی تعداد کو گھٹانا ہے، اگر کوئی اور وجہ ہے تو اُس کا بتانا پروفیسر صاحب کا فرض ہے،

(بقیہ حاشیہ ۲۱۷) یاد نہین مگر ان کا مضمون اتنا طویل ہو گیا تھا، کہ اس کی اشاعت کی گنجایش نہین تھی، اس لئے بعض جوابات جو نسبتاً غیر ضروری معلوم ہوئے حذف کر دیئے گئے تھے، اس لئے اُس کی ذمہ داری اُن پر نہین، ذ،

مضمون کا طول کم کرنے کو اُن کے جوابات مشمولہ معارف بابت دسمبر ۵۵ء کا جائزہ نہین لیتا، البتہ پروفیسر صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہون کہ انھون نے توجہ دلائی اور حضرت شادانی سے معافی کا خواستگار ہون کہ اُن کا یہ شعر نہ معلوم کس دھن مین غلط نقل کر گیا، اور پھر معترض ہوا،

نہ کچھ کہنا نہ سننا اور حالِ دل سمجھ لینا — خموشی ہی محبت کی زبان معلوم ہوتی ہے

مین نے سننا سے پہلے بھی کچھ کا اضافہ کر دیا، غالباً اُس وقت میرا ایک شعر بھی میرے دماغ مین چکر کھا رہا تھا، اور شادانی صاحب کے شعر سے خلط مبحث ہو گیا،

نہ کچھ کہنا نہ کچھ سننا فقط منھ تکتے رہ جانا — اور اُس کے بعد پچھتانا کہ حسرت کہہ نہ دی اپنی

سبب جو کچھ ہو مجھے اپنی غلطی پر افسوس اور ندامت ہے،

مگر تلافی بھی ہو گئی، "چھان بین" کے ایک مضمون مین مین نے سہواً جرأت کا ایک شعر انشا سے منسوب کر دیا، پروفیسر صاحب نے "آوارہ گرد اشعار" کے سلسلے مین مجھے سخت سرزنش کی دسمبر کے معارف مین پروفیسر صاحب نے یہ شعر مصحفی سے نامزد کیا ہے،

لپٹون ہون مین اپنے ہی گلے سے — سمجھون ہون کہ ہے کنار تیرا

حالانکہ یہ شعر انشا کا ہے، اور پروفیسر صاحب نے مصرع اولیٰ مین تھوڑا تصرف کر دیا ہے، صحیح مصرع یہ یون ہے،: "لپٹون ہون گلے سے آپ اپنے"

پوری غزل اُن کے کلیات مین موجود ہے،

دسمبر کے معارف مین پروفیسر صاحب نے شادانی صاحب پر براہ راست دھاوا بول دیا ہے، ٹھیرے ٹھیرے بدلائی ہونے دیجئے، بندہ رخصت،

وفیات

ایک شریف النفس صاحب فضل دوست کی دائمی مفارقت

پروفیسر شیخ عبدالقادر سرفراز (پونہ)

از

مولانا سید سلیمان ندوی

ناسک (بمبئی) کے ایک خط سے جو مرحوم کے چھوٹے بھائی نے مجھے لکھا تھا یہ معلوم کرکے بڑا تاسف ہوا کہ میرے چالیس برس کے دوست پروفیسر شیخ عبدالقادر سرفراز نے پونہ میں اپنے مکان کاشانۂ حق میں ار دسمبر ۱۹۵۲ء کو ساڑھے نو بجے انتقال فرمایا، اس کے بعد مرحوم کے بڑے صاحبزادہ ڈاکٹر شیخ عبدالحق ایم اے، پی، ایچ، ڈی پروفیسر اردو و فارسی (بمبئی) کی اطلاع سے اور بہت سی باتیں معلوم ہوئیں، یہ بھی معلوم ہوا کہ مرحوم کو بڑھاپے اور شیخوخت کے ضعف کے سوا کوئی خاص مرض نہ تھا، بصارت سے معذور ہو چکے تھے، ایک ہفتہ سے ضعف بڑھتا جاتا تھا، ڈاکٹروں کے معائنہ سے قلب اور اعضائے رئیسہ توانا پائے گئے، حواس آخر تک بجا تھے، سوا نو بجے خود آنکھیں بند کرلیں، لب ہل رہے تھے، غالباً کلمہ پڑھ رہے تھے، ۱۵ منٹ کے بعد یعنی ساڑھے نو بجے صبح کو اس دنیائے دنی سے سفر اختیار کیا،

۸ر جولائی ۱۸۷۹ء پیدایش کی تاریخ تھی، تہتر برس کی عمر پائی، مرحوم کا خاندان دراصل یوپی کا باشندہ تھا، غدر کے ایام میں بمبئی کی طرف نکل گیا، مرحوم کے والد شیخ سرفراز ڈاکٹر تھے، انھوں نے ناسک کو اپنا وطن بنایا،

لیکن مرحوم کی عمر کا بڑا حصہ پونہ اور بمبئی میں گذرا، ۱۹۰۱ء میں بمبئی یونیورسٹی سے ایم اے پاس کیا، اور غالباً ان کا خاص موضوع فارسی تھا، اُس زمانہ میں ایک شریف ایرانی فاضل پروفیسر مرزا حیرت بمبئی یونیورسٹی میں فارسی کے مسند نشین صدر تھے، اُن کا غیر معمولی فضل و کمال تمام بمبئی میں مسلّم تھا، مرحوم شیخ عبدالقادر کو فارسی کا ذوق اُنھی کی صحبت سے حاصل ہوا، چنانچہ مرزا حیرت کی انھوں نے مختصر سوانح عمری بھی لکھی ہے، اور مجلس میں اکثر اُن کے فضائل اور اخلاق اور حالات ذکر کیا کرتے تھے،

ایم اے ہونے کے بعد وہ فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے، اس زمانہ میں سندھ کا صوبہ بمبئی کے احاطہ سے ملحق تھا، اس لئے ان کا تقرر پہلے سندھ میں ہوا، اور اس طرح زبانوں کے شائق کے لئے ایک نئی زبان سندھی کا دروازہ کھل گیا، اور وہ اس سے کچھ ہی دنوں میں آشنا ہو گئے، یہاں اُن کا قیام مختصر رہا، یہاں سے وہ جلد بمبئی میں منتقل کر دئے گئے، جہاں یکے بعد دیگرے الفنسٹن کالج بمبئی اور دکن کالج پونہ میں السنۂ مشرقیہ کے پروفیسر رہے، ۱۹۳۳ء میں ریٹائرڈ ہو کر انھوں نے اپنی بیوی اور تین صاحبزادوں کے ساتھ حج کیا، واپسی کے بعد بدستور اپنے مکان موسوم کاشانۂ حق پونہ میں مستقل سکونت اختیار کی۔

مولانا شبلی مرحوم سے اُن کی ملاقات ۱۹۰۶ء میں بمبئی میں ہوئی، اُس وقت مولانا شعر العجم کی تکمیل میں مصروف تھے، دونوں میں تعلقات کی وابستگی کا رشتہ یہی فارسی شعر و ادب کا ذوق تھا، وہ فارسی کے یورپین مستشرقین کی تحقیقات سے مولانا کو مطلع کیا کرتے تھے، اور بعض مضامین کے ترجمے بھیجا کرتے تھے، مکاتیب شبلی میں مرحوم کے نام جو مولانا کے خطوط ہیں، ان سے ان تعلقات کی پوری حقیقت ظاہر ہوتی ہے،

راقم سے مرحوم کی واقفیت کا واسطہ بھی مولانا ہی تھے، ۱۹۱۳ء میں جب میں الہلال کلکتہ سے قطع تعلق کرکے واپس آیا تو ایک ماہوار رسالہ کا خیال دل میں تھا، جو الندوہ کا جانشین ہو، مولانا نے اس خیال کو پسند فرمایا اور مجھے لکھنؤ بلا لیا، ابھی اس اسکیم پر غور ہی ہو رہا تھا کہ ایک نئی صورت پیش آ گئی جس نے زندگی کا رُخ بدل دیا،

اللہ تعالیٰ کا ایک عجیب معاملہ اس بندۂ بے استحقاق کے ساتھ پوری زندگی مین جاری رہا ہے، کوئی خدمت ہو یا کوئی علمی و قومی منصب ہو میری طلب، اور سعی و کوشش کے بغیر مجھے عنایت ہوا، چنانچہ جہان گیا بحمد اللہ مطلوب بن کر گیا، طالب بن کر نہین، چنانچہ ایسا ہی اس وقت پیش آیا، انگریزی عہد مین کسی طلب و درخواست کے بغیر کسی سرکاری نوکری پانے کا تصور بھی نہین کیا جا سکتا تھا مگر میرے ساتھ یہ بھی ہوا، مین انھین دنون لکھنؤ مین مقیم تھا کہ مجھے بمبئی گورنمنٹ کے محکمۂ تعلیم کا سرکاری لفافہ موصول ہوا کہ تم کو دکن کالج پونہ مین السنۂ مشرقیہ کا اسسٹنٹ پروفیسر مقرر کیا گیا، مین سمجھا کہ میرے پتہ پر یہ غلط مراسلہ آگیا ہے، کیونکہ مین نے تو اس کی درخواست بھی نہین دی تھی، مین اسی حیص بیص مین تھا کہ اس مراسلہ کو کیا کرون کہ شام کی حاضری مین مولانا سے اس واقعہ کو بیان کیا، فرمایا کہ مراسلہ آگیا اچھا ہوا مین نے ہی تحریک کی تھی پروفیسر عبد القادر صاحب کو شکریہ کا خط لکھو، اور پونہ روانہ ہو جاؤ، مین نے کچھ معذرت کرنی چاہی، مگر ان کی خوشی اسی مین پائی، اور شیخ صاحب کے پاس پونہ روانہ ہو گیا، اور ڈھائی تین سال کے قریب اُن کے ساتھ رہا، انھون نے اپنے بنگلہ کے پاس ہی ایک چھوٹی سی بنگلیا مین میرے قیام کا انتظام کیا، اور اپنے ہی پاس مہمان رکھا، اور اپنے ہی ساتھ مجھے کالج لانے اور لیجانے لگے، اس واقعہ کے ڈیڑھ دو سال کے بعد مولانا نے نومبر ۱۹۱۴ء مین انتقال فرمایا، اور مجھے سب کام چھوڑ کر سیرت کی تکمیل کا اشارہ ہوا، چنانچہ دار المصنفین کے قیام کے بعد ایک سال کے اندر مجھے پونہ چھوڑنا پڑا، اور زندگی نے ایک نئے رُخ پر پلٹا کھایا،

شیخ صاحب کے ساتھ یہ چند سال اس طرح گذرے کہ روز و شب مین ضروری اوقات کے علاوہ ہمیشہ یکجائی رہتی، اور تجربہ نے بتایا کہ شیخ صاحب جیسا شریف انسان دنیا نے کم پیدا کیا، وہ ایک مرنجان مرنج طبیعت رکھتے تھے، دوستون کی ہر ضرورت مین کام آتے تھے، نہایت صاف دل اور بے تکلف تھے، پونہ سے میرے آنے کے بعد بانکی پور کی خدا بخش خان لائبریری کے دیکھنے کے بہانہ وہ میرے پاس پٹنہ اور پھر اعظم گڈھ دار المصنفین آئے، اور چند روز یہان بہت خوشی اور دلچسپی کے ساتھ رہے، وہ بمبئی کے اضلاع کے علاوہ ہندوستان کے کسی

دوسرے شہر یا صوبہ مین شاید کبھی گئے ہون، اس لئے یو پی کے موسم اور آب و ہوا اور اسلامی تمدن وغیرہ کو دیکھکر انھین بڑی دلچسپی ہوئی،

میرے قیام پونہ کی بڑی یادگار ارض القرآن کی تصنیف ہے، اگرچہ اس کا آغاز کلکتہ ہی مین کیا جا چکا تھا، مگر اُس کی تکمیل اسی زمانہ مین ہوئی، اور یقین سے کہا جا سکتا ہو کہ اگر شیخ صاحب کی رفاقت نہ ہوتی، تو اس کتاب کو کبھی اس طرح نہ لکھ سکتا، پونہ مین ہونے کی وجہ سے جہان اسرائیلی یہودیون کی سکونت ہے، مجھے عبرانی سے آشنا ہونے کی فرصت ہاتھ آئی، اور شیخ صاحب کے ذریعہ سے بمبئی کے کتب خانون سے کتابون اور پرانے علمی رسالون کے ملنے کے مواقع ہاتھ آئے، اور عجب نہین کہ اسی کام کے لئے مشیتِ الٰہی نے پونہ کا قیام میرے لئے مقدر کیا تھا،

شیخ صاحب مرحوم کو زبانون کے سیکھنے کا عجب ملکہ تھا، وہ مہاراشٹر مین رہنے کے باوجود، اردو مادری زبان کی طرح جانتے تھے، اور لکھتے اور بولتے تھے، جدید اور قدیم فارسی دونون پر قدرت حاصل تھی، عربی زبان وہ اس وقت نہین جانتے تھے، اور میرے بلوانے سے ان کا مقصد یہی تھا کہ وہ عربی زبان سیکھیں، چنانچہ میرے پہنچنے پر وہ باقاعدہ طالب علمون کی طرح کچھ دنون عربی صرف و نحو پڑھتے رہے، اس کے بعد بمبئی کے قیام مین عربون سے عربی بولنے کی مشق کی، اور خاصی عربی بولنے اور سمجھنے لگے، مرہٹی زبان مثل ایک برہمن مرہٹہ کے وہ جانتے تھے، اور اس بارہ مین خود برہمن مرہٹے اور گورنمنٹ اُن کی قابلیت کو تسلیم کرتی تھی، اور مرہٹی زبان کی کمیٹیون مین اُن کو ممبر بناتی تھی، بمبئی یونیورسٹی مین مرہٹی ٹکسٹ بک کمیٹی کے ممبر رہے، مہاراشٹر یونیورسٹی کی تحقیقاتی کمیٹی کا ممبر بھی حکومت نے اُن کو بنایا، اس کمیٹی کا خیال تھا کہ مہاراشٹر کے مسلمانون کی زبان مرہٹی ہے، مگر شیخ صاحب نے تاریخی دلائل اور شخصی شہادتون سے ثابت کر دیا کہ اُن کی زبان دکھنی اردو ہے، اور کمیٹی کی رپورٹ کے ساتھ ایک طویل اختلافی نوٹ لکھا جس کو حکومت نے رپورٹ کے ساتھ شائع کیا،

پوری یونیورسٹی مین السنۂ مشرقیہ کے دائرہ مین شیخ صاحب کی حیثیت ممتاز تھی، وہ اُس کے نصاب

امتحان اور کمیٹیون مین ہمیشہ ممبر ہوتے رہے، ۱۹۱۹ء مین دبمبئی یونیورسٹی کے فیلو اور ۱۹۲۰ء مین انڈین ایجوکیشنل سروس مین داخل ہوئے، ۱۹۲۴ء مین وہ بمبئی برٹش رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے فیلو، اور ۱۹۲۶ء مین بمبئی جے پی یعنی جسٹس آف پیس مقرر ہوئے، اس کے علاوہ وہ تقریباً چودہ مختلف تعلیمی انجمنون کے صدر یا ممبر تھے، ۱۹۳۱ء مین گورنمنٹ کی قدر شناسی سے شمس العلماء کے بجائے خان بہادر بنائے گئے، جس کو انھون نے اپنے نام کے ساتھ بہت کم استعمال کیا،

شیخ صاحب مرحوم کا تحقیقاتی مطالعہ بہت وسیع تھا، کتابون کے شائق تھے، اور اچھا خاصہ مختصر سا کتب خانہ ان کے پاس جمع تھا، دن رات مطالعہ اور تحقیقات کے سوا ان کا کوئی دوسرا کام نہ تھا، اُن کو شکایت تھی کہ کام کرنے مین نیند آنے لگتی ہے، اس کے لئے یہ تدبیر کی کہ میز اونچی کرکے کھڑے ہوکر کام کرنا شروع کیا، گو انھین لکھنے کی فرصت کم ملتی تھی، بااین ہمہ انھون نے اپنی کچھ تحریری یادگارین بھی چھوڑی ہین جن زیادہ تر انگریزی اور کچھ اردو مین ہین، پروفیسر مرزا حیرت کے سوانح، قصائد قاآنی، اور انگریزی مین تاریخ طبری کے کچھ حصے کتابی شکل مین شائع کئے، مطبوعہ کتابون کی تصحیح اور تحشیہ جیسے غیر دلچسپ کام سے بھی انھیں دلچسپی تھی، چنانچہ اپنے مطالعہ اور کورس کی کتابون کی یہ خدمت اکثر انجام دیا کرتے تھے، اسی سلسلہ مین فارسی شعراء مین سے انوری، ظہیر فاریابی، قاآنی اور خاقانی کے دواوین اور سبحۃ الابرار جامی کی پوری تصحیح کی اور حاشیے لکھے، وقائع نعمت خان عالی کی نہایت دقت نظر سے تصحیح کی، متن درست کیا، تاریخی واقعات اور ادبی نکات پر نوٹ لکھے، جہانگشائے نادری، اور مثنوی معنوی پر حواشی چڑھائے، پروفیسر براؤن کی مشہور تصنیف تاریخ ادبیات ایران پر ناقدانہ انداز سے حاشیے لکھے، لیکن افسوس ہے کہ ان میں کوئی چیز شائع نہیں ہوئی، اور یہ سب مسودے ان کے کتب خانہ مین سربستہ راز کی طرح امانت ہین، شاید ان کے برادر صاحبزادہ ڈاکٹر عبدالحق ادھر توجہ کرین۔

اُن کی جو کتاب شائع ہوئی ہے، وہ بمبئی یونیورسٹی کے فارسی، اردو اور عربی مخطوطات کی توضیحی فہرست ہے، جو کئی سو صفحون مین ہے، اور جس کو یونیورسٹی نے شائع کیا ہے، یہ فہرست مشرق و مغرب کے اصول تنقید اور طرز تحقیق کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے، اور مستشرقین کی تحقیقات پر جا بجا تنقیدین کی گئی ہین، ایک بسیط مقالہ انگریزی مین فارسی یائے معروف و یائے مجہول پر لکھا، جو بمبئی رائل ایشیاٹک سوسائٹی مین چھپا، اور اس کا خلاصہ ترجمہ معارف مین طبع ہوا،

شیخ صاحب کو مولانا شبلی مرحوم سے عقیدتمندانہ شیفتگی، اور ہم خواجہ تاشون سے مخلصانہ محبت تھی، جس کو زمانہ کی قدامت اور مکانون کی مسافت بھی کم نہ کرسکی، جب میرا کراچی آنا ہوا تو ایک خط مین حسب ذیل شعر لکھ کر بھیجا،

وفا آموختی از ما بکار دیگران کردی ربودی گوہری از ما نثار دیگران کردی

افسوس کہ علم و فضیلت اور اخلاق و اخلاص کا یہ مجسمہ ہماری نگاہون سے ہمیشہ کے لئے پوشیدہ ہوگیا، وہ پونہ کے ہندو اور مسلمانون مین یکسان ہردلعزیز تھے، اس لئے اُن کی وفات پر سبنے سوگ کیا، اور ان کے جنازہ کی مشایعت مین سبنے شرکت کی، اور وہین قبرستان مین اپنی اہلیہ مرحومہ کی قبر کے پہلو مین دفن ہوئے، مگر مرحوم کا اصلی مزار اُن کے احباب کے دل ہین جن مین اُن کی یاد ہمیشہ بسی رہے گی،

بعد از وفات تربت ما در زمین مجو

در سینہ ہائے مردم عارف مزار ما

ارض القرآن حصہ اول

عرب کا قدیم جغرافیہ، عاد، ثمود، سبا، اصحاب الایکہ، اصحاب الحجر، اصحاب الرس کی تاریخ اس طرح لکھی گئی ہے جس سے قرآن مجید کے بیان کردہ واقعات کی یونانی رومی، اسرائیلی لٹریچر اور موجودہ آثار قدیمہ کی تحقیقات سے تائید و تصدیق کی ہے، قیمت :- ؎ ۲ ؎

"منیجر"

ادبیات

"سلام"

ازجناب فضا ابن فیضی

اے تری بارگاہ میں جبرئیل سجدہ ریز   اے تجھ سے خود زبانِ خداوند ہمکلام

اے تری بزم بوذر و سلمانؓ سے ہمکنار   اے تیرے لب پہ رقص کناں وحی کے پیام

اے حاملِ رسالتِ محکم! تجھے سلام

لالے کو دیکے ذوقِ جگر کاویِ حیات   شبنم سے تونے رازِ گلستان کیا نہ فاش

قربان تری اداؤں کے دستِ خلیل سے   آذر کے آئینے کو کیا تونے پاش پاش

اے امتزاجِ شعلہ و شبنم! تجھے سلام

ترتیب دیکے دانش و دین کے اصولِ نو   اسرارِ زندگی کو نمایاں بنا دیا

پھونکی وہ روح تونے ضمیرِ حیات میں   انسان کو اصل معنوں میں انسان بنا دیا

تہذیبِ زندگانیٔ آدم! تجھے سلام

اے تیری ہر نگاہ ہر اک دفترِ الست   اے تیرا حرف حرف ہے توراتِ آگہی

لرزاں ترے اشارۂ ابرو پہ کائنات   اے تونے دی جہان کو زیبِ خدا رسی

اے کاشفِ نگارشِ مبہم! تجھے سلام

دونوں ہیں تیرے خرمنِ عرفاں کے خوشہ چیں   عقلِ اداشناس و جنونِ زیاں و سود

روشن ہے تیرے نور سے یہ بزمِ شش جہات   محکم ہے تیری ذات سے شیرازۂ وجود

اے رازِ آفرینشِ عالم! تجھے سلام

ٹوٹی ہوئی امیدیں تجھی سے ہیں پائدار   ڈوبی ہوئی امنگوں کا ساحل تو ہی تو ہے

ان آنسوؤں کے ٹوٹے ہوئے تار کی قسم   دکھ درد، غم کے ماروں کی منزل تو ہی تو ہے

بارانِ ابرِ رحمتِ پیہم! تجھے سلام

وہ نعمتِ تمام وہ روحانیت کی جان   قرآن تجھ کو لاکے دیا جبرئیل نے

دونوں جہاں کو بخش دیا جلوۂ دوام   پیغام کیا دیا تجھے ربِ جلیل نے

اے نورِ ذات و حسنِ مجسم! تجھے سلام

اسلام کے پیمبرِ اعظم! تجھے سلام

کیفِ تغزل

ازجناب ولی الرحمٰن صاحب ولی

نہ حرم کی ہے مجھے جستجو، نہ درِ بتاں کی تلاش ہے   ترے نقشِ پا کی ہے آرزو ترے آستاں کی تلاش ہے

نہ طلب ہے نغمۂ دیر کی نہ مجھے اذاں کی تلاش ہے   جو دلوں کی آگ کو چھیڑ دے مجھے اس فغاں کی تلاش ہے

مجھے ناخدا سے غرض نہیں مجھے خوفِ موجِ رواں نہیں   جو لگا دے کشتیِ دل کو پار اسی بادبان کی تلاش ہے

بس بہ پردہ ہو چکی گفتگو کبھی سامنے بھی تو آؤ تم   یہ زمین کو لیکے گردن لگا گیا، مجھے آسمان کی تلاش ہے

کبھی اٹھ کے شعلۂ دل دکھا تو ہی اس غریب کو یہ بتا   کہ اندھیری رات میں برق کو مرے آشیاں کی تلاش ہے

ترا جلوہ میری شراب ہے، مری سجدہ گہ ترا سنگِ در   نہ طلب مجھے سرِ خم کی، نہ درِ مغان کی تلاش ہے

جو جل کے خاک جو آشیان تو یہ خاک ہے کہ کدھر گیا   غمِ عارضی ہے عذابِ جان غمِ جاوداں کی تلاش ہے

جو عطا ہو دولت دو جہان تو کبھی قبول نہ مین کرون
ترا ہو دیٔ عشق ملے مجھے، اسی ارمغاں کی تلاش ہے

تری جو غزل ہے وہ اے وصی ہے خزانہ فکر بلند کا
نہ محاورے کی ہے جستجو، نہ تجھے زبان کی تلاش ہے

غزل

از سید اختر علی تلہری، شاہجہانپوری

ہوس کار، تجھکو محبت کہاں ہے
تجھے ہر نفس فکر سود و زیان ہے

چمن ہے کہیں اور کہیں کہکشاں ہے
ترے حسن کی بھی عجب داستان ہے

نگاہ حقیقت نگر رحم فرما
نہ وہ پھول اب ہین نہ وہ گلستان ہے

خبردار اے جذبہ سر فروشی
کہ بیش نظر پھر کہین امتحان ہے

پریشان ہے کیون فکر ساحل مین ناداں
محبت کے قلزم میں ساحل کہاں ہے

نظر کی ہے دنیا کہ دل کی ہو دنیا
ہین رنگینیان بھی وہیں تو جہان ہے

مرے ناخدا ناؤ کھینا سنبھل کر
کہ ہر موج میں ایک طوفاں نہاں ہے

مرے ہم نفس تو یہ کیا کہہ رہا تھا
جہان آشیان تھا وہاں اب دھوان ہے

نہ جانے کہ گلچیں نے کیا رنگ بدلا
چمن بھر مین اک شور آہ و فغان ہے

بدلنے میں اٹھا ہون دنیا کو جیسے
زمیں ہے مری اور مرا آسمان ہے

مجھے بخشش ذوق نظر تیرے صدقے
کہ محروم نظارہ تیرا جہاں ہے

ادم در ارم دل تو اپنا ہے اختر
بلا سے چمن مین جو دور خزان ہے

باب التقریظ والانتقاد

ہسٹری آف ٹیپو سلطان[1]

از

سید صباح الدین عبدالرحمن ایم، اے

گذشتہ بیس سال کے اندر مسلمان اہل قلم نے انگریزی زبان مین تاریخ ہند کی مفید اور قابل قدر کتابین لکھی ہین، ڈاکٹر محمد ناظم نے "سلطان محمود آف غزنہ" لکھکر اس جلیل القدر فاتح اور عظیم المرتبت فرمانروا کی سیرت و کردار سے متعلق بہت سی نئی باتین پیش کین، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے اپنی کتاب "ایڈمنسٹریشن آف سلطنیٹ آف دہلی" مین تاریخ ہند کو نئے زاویۂ نظر سے مطالعہ کرنے کی ترغیب دی، ڈاکٹر محمد حبیب اللہ نے "فونڈیشن آف دی مسلم رول اِن انڈیا" مرتب کرکے ایک خاص ڈھنگ سے مسلمانون کی فتح و تسخیر اور اُن کے طرز حکومت کی نوعیت بتانے کی کوشش کی، ڈاکٹر عزیز احمد نے "ارلی ٹرکش امپائر ان انڈیا" مین بہت سے مفید معلومات کا اضافہ کیا، تیموری عہد پر ڈاکٹر ابن حسن نے "سنٹرل اسٹرکچر آف دی مغل ایمپائر" مین مغلون کے نظام حکومت کے بعض تاریک پہلوؤں کو بڑی خوبی اور وضاحت سے روشن کیا، حبیب

[1] ہسٹری آف ٹیپو سلطان از محب الحسن خان بی اے، (لندن) لکچرار اسلامک ہسٹری اینڈ کلچر کلکتہ یونیورسٹی، ضخامت ۳۲۳ صفحے، لکھائی چھپائی، کاغذ عمدہ، قیمت پندرہ روپیہ، ملنے کا پتہ:- Bibli-
ophile، کلکتہ یا ڈھاکہ،

محمد بشیر احمد نے دی ایڈمنسٹریشن آف جسٹس ان مڈیول انڈیا" لکھ کر یہ بتایا کہ ہندوستان کا موجودہ نظامِ عدل وانصاف کس حد تک عہدِ مغلیہ کے نظام کا رہین منت ہے، جناب ظہیر الدین فاروقی نے "اورنگ زیب اینڈ ہز ٹائمس" میں اس مسلمان حکمران سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں دور کین،

خوشی کی بات ہے کہ جناب محب الحسن خان صاحب لکچرار شعبۂ اسلامی تاریخ وتمدن کلکتہ یونیورسٹی نے بھی تاریخ ہند کے لٹریچر مین کتاب "ہسٹری آف ٹیپو سلطان" لکھ کر اہم اضافہ کیا ہے،

ٹیپو سلطان ہندوستان مین اسلامی ترکش کا "آخری خدنگ" اور جنگاہ شوق کی آخری تکبیر تھا، وہ اپنے ملک وقوم کی عزت وناموس کے خاطر بیرونی دشمنون سے لڑتا، اور یہ کہتا ہوا شہید ہوا کہ

"گیدڑ کی سوسالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی اچھی ہے"،

انگریزون نے اس کو مکر وفریب سے شہید کرکے اس ملک مین اپنی سامراجی قوت کا پرچم لہرایا، اور ٹیپو جیسے جانباز محبِ وطن کو ہر طرح سے بدنام کرنے کی کوشش کی، شاید ہی کوئی ایسا عیب ہو، جو اس کی طرف منسوب نہ کیا گیا ہو، لیکن انھون نے اس کو جتنا زیادہ بدنام کرنے کی کوشش کی، اتنا ہی یہ شہید ملک وملت اپنے ہم وطنون مین محبوب اور عزیز ہوتا گیا، میسور مین اس بہادر فرمانروا کو اب بھی شیر میسور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اسکی سیرت اور کردار سے متاثر ہو کر اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کیا ہے،

آن شہیدانِ محبت را امام آبروے ہند وچین وروم وشام،
نامش از خورشید ومہ تابندہ تر خاکِ قبرش از من وتو زندہ تر،
عشق رازے بود بر صحرا نہاد تو ندانی جان چہ مشتاقانہ داد

از نگاہِ خواجۂ بدر وحنین، فقرِ سلطان وارثِ جذبِ حسین
رفت سلطان زین سرائے ہفت روز نوبتِ او در دکن باقی ہنوز

مولانا ظفر علی خان اکتوبر ۱۹۳۱ عیسوی مین جب سرنگاپٹم گئے تھے، تو اس شہر کو مخاطب کرکے کہا تھا،

اے سرنگاپٹم[1]، اے گنجِ شہیدان آخری وقت مین اسلام کی غیرت کی نمود
سو رہا ہے ترے پہلو مین میسور کا شیر مایۂ ناز تھا ملت کے لئے جس کا وجود
قوتِ بازوے اسلام تھی اس کی صولت اس کی دولت کے دعاگوؤن مین شامل تھے ہنود
کہین سوتے مین نہ کروٹ یہ مجاہد بدلے اب بھی اس خوف سے ہین لرزہ براندام حسود

اُس کے اٹھتے ہی مسلمانوں کا گھر بیٹھ گیا
تھا قیامت کا قیام، اور قیامت کا قعود

آخر مین ٹیپو سلطان کی روح کو مخاطب کرکے فرماتے ہین :-

مین نے کی عرض کہ اے فطرتِ آزاد کی روح توڑ دی جس نے سکھائی ہین غلامی کی قیود
بر زمینے کہ نشانِ کفِ پاے تو بود سالہا سجدۂ صاحب نظران خواہد بود

گاندھی جی ٹیپو سلطان کو ہندو مسلم اتحاد کا مجسمہ کہتے تھے، چنانچہ اپنے مشہور ومعروف اخبار "ینگ انڈیا" مین لکھا تھا کہ

"میسور کا بادشاہ فتح علی ٹیپو سلطان اجنبی (انگریزی) مورخون کی نگاہ مین متعصب مسلمان تھا، جس نے اپنی ہندو رعایا کو بجبر مسلمان بنایا، لیکن

---

[1] سرنگاپٹم کے عنوان سے مولانا ظفر علی خان نے جو نظم لکھی تھی، اس مین سے یہان پر صرف چند اشعار پیش کئے گئے ہین،

"یہ سب جھوٹ ہے، حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤں سے اس کے تعلقات بہت دوستانہ رہے ... ...

... ... اس عظیم المرتبت سلطان کا وزیر اعظم ایک ہندو تھا، اور نہایت شرم سے یہ کہنا پڑتا ہے، کہ اس نے اس فدائے آزادی کو دھوکا دے کر دشمنوں کے ہاتھ مین دے دیا ... ...

... ... ٹیپو نے ہندو مندروں کے لئے نہایت فیاضی سے جائدادین وقف کین، خود ٹیپو سلطان کے محلات کے گرد وپیش شری رنگا ناتھ، شری نواس اور شری رنگناتھ کے مندروں کی موجودگی سلطان کی وسیع النظری اور رواداری کا ثبوت ہین، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سلطان شہید جس سے بڑا شہید ملک وملت دوسرا نہین مل سکتا، اپنے اللہ کی عبادت مین ہندوؤں کی پوجا کی گھنٹیون سے پریشان نہ ہوتا تھا، ٹیپو آزادی کے ساتھ جنگ کرتا ہوا شہید ہوا، مگر اس نے دشمن کی اطاعت گوارا نہ کی"[1]

اسی آبروئے ہند وچین وروم وشام "آیۂ ناز ملت" اور ہندو مسلم اتحاد کے مجسمہ کی مکمل اور مفصل تاریخ جناب محب الحسن خان نے زیر نظر کتاب مین لکھی ہے، جو ۴۰۴ صفحات، ۲۲ ابواب اور ۸ ضمیمون پر مشتمل ہے، پہلا باب ٹیپو کے خاندان، عہد طفلی اور تخت نشینی پر ہے، اس کی پوری زندگی جنگ وجدل مین گزری، اس لئے اٹھارہ ابواب مین اس کے زمانہ کی مختلف لڑائیون کا ذکر ہے، آخری تین بابون مین اس کے نظام حکومت، اس کی مذہبی پالیسی اور اس کی سیرت کا ناقدانہ مطالعہ کیا گیا ہے،

[1] منقول از تاریخ سلطنت خداداد، مصنفہ محمود بنگلوری،

اس کتاب کے مطالعہ سے یہ اثر پیدا ہوتا ہے کہ ٹیپو سلطان ایک بہادر سپاہی، بیدار مغز مدبر، اولوالعزم حکمران، نظم ونسق مین ماہر، مذہبی خیالات مین روادار، ملک کی تجارت، زراعت اور صنعت وحرفت کی ترقی کا خواہان، اسلامی ممالک کی یکجہتی کا داعی، اور ہندوستان مین مختلف قومون اور فرقون کے اتحاد کا حامی تھا، اگر وہ موجودہ دور کے ہندوستان مین پیدا ہوتا، تو ایک محبوب رہنما، اور غیر معمولی قسم کا سیاست دان مانا جاتا، لیکن ٹیپو سلطان مین رحمدلی اور عفو وحلم کے اوصاف اعتدال سے زیادہ تھے، جو تاج وتخت کے مالک کیلئے ہر حال مین مفید نہین ہوتے، ٹیپو کے اردگرد غدارون، منافقون، اور خود غرضون کی ایک بڑی جماعت موجود رہی، مگر وہ اپنی مروت اور شرافت اخلاق سے ان سب کو انگیز کرتا رہا، اور ان ہی نمک حرامون اور بد باطنون نے نہ صرف اس کی بلکہ پورے ملک کی عزت وناموس کو خاک مین ملا دیا، اس کی زندگی اس حیثیت سے ضرور ناکام رہی کہ وہ ہندوستان کو بیرونی دشمنون سے پاک نہ کرسکا، مگر وہ ان سے مسلسل سترہ سال تک لڑتا رہا، اور بالآخر اپنی جان تک دیدی، مگر اس کی اس ناکامی سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ اگر ملک کے مختلف گروہون مین یکجہتی اور یگانگت نہ ہو، تو وہ کس طرح تباہ وبرباد ہوکر دوسرون کا غلام بن سکتا ہے،

لائق مؤلف نے بڑی محنت اور تلاش وجستجو سے یہ کتاب لکھی ہے، اور ٹیپو سلطان سے متعلق جہان کہین سے بھی کچھ مواد مل سکا ہے، اس سے انھون نے فائدہ اٹھایا ہے، اور اس کا تجزیہ کرکے ٹیپو کی زندگی کے ہر پہلو کو واضح اور منقح کیا ہے، ان کے ماخذون کی فہرست صرف فارسی، انگریزی، اور اردو کتابون اور دستاویزات تک محدود نہین ہے، بلکہ انھون نے فرانسیسی، ولندیزی، پرتگالی، مرہٹی، تامل، تلنگو، اور کنڑی ماخذون سے بھی فائدہ اٹھایا ہے، مگر معلوم نہین، اس فہرست مین میجر بی، ڈی، باسو کی مشہور ومعروف کتاب رائز آف دی کرسچین پاور ان انڈیا کا نام کیون چھوٹ گیا ہے، جس کی جلد دوم کے سترہوین باب مین ٹیپو کی زندگی پر مختصر مگر جامع بحث ہے، اور اس سے

انگریزون کی ریشہ دوانیون اور فریب کاریون کے سمجھنے مین بڑی مدد ملتی ہے، اگرچہ یہ کوئی فردگذاشت نہین ہے، اور یہ بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ پر محنت و کاوش، تحقیق و تدقیق، اور تلاش و جستجو سے جو کتابیں لکھی گئی ہین، اُن ہی مین زیر نظر کتاب بھی ہے، اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ لائق مؤلف کے طرز تحریر اور اسلوب بیان مین وہی خوبیان موجود ہین، جو جدوناتھ سرکار کی مشہور تصنیف "ہسٹری آف اورنگزیب" مین پائی جاتی ہین، مگر دونون مین فرق یہ ہے کہ ایک نے ایک حکمران کی سیرت کی تعمیر کی ہے، اور دوسرے نے تخریب کی کوشش کی ہے،

مگر کوئی کتاب کتنی ہی محنت و تحقیق سے لکھی جائے، فروگذاشتون سے یکسر پاک نہین ہو سکتی، چنانچہ اس کتاب مین بھی بعض خفیف فردگذاشتین ہوگئی ہین، مثلاً پہلے ہی صفحہ پر حضرت گیسو دراز کا نام جمال الدین حسینی لکھا گیا ہے، کسی تذکرہ مین ان کا یہ نام نظر سے نہین گزرا، اور تمام تذکرون مین اسم گرامی سید محمد، اور کنیت ابو الفتح ہے، فاضل مؤلف نے کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم پر بھروسہ کیا، اسی لئے یہ چوک ہوگئی، کیمبرج ہسٹری کے مؤلف نے جمال الدین حسینی کے ساتھ nickname - Gisu Daraz لکھا ہے، ہمارے لائق مؤلف نے بھی اپنی تحریر مین nickname ہی رہنے دیا ہے، حالانکہ حضرت خواجہ گیسو دراز کے لئے اس لفظ کا استعمال بالکل مناسب نہین ہے، لیکن اس قسم کی معمولی فردگذاشتون سے کتاب کی مجموعی خوبی پر کوئی حرف نہین آتا،

عرصہ سے ٹیپو سلطان پر اخبارون اور رسالون مین مضامین نکل رہے تھے، اُن سے اس جلیل القدر فرمانروا کا پورا حق ادا نہین ہوتا تھا، ۱۹۳۴ء مین جناب محمود صاحب بنگلوری نے اردو مین تاریخ خداداد سلطنت لکھ کر ایک حد تک اس کمی کو پورا کر دیا تھا، مگر جناب محب الحسن خانصاحب نے یہ کتاب لکھ کر پورا حق ادا کر دیا، اور اس جامع اور محققانہ تصنیف کے بعد ٹیپو سلطان کی زندگی کے کسی پہلو کو روشن کرنے کی ضرورت باقی نہین رہی، اگر فاضل مؤلف نے

اجازت دی، تو ہم اس کتاب کے خاص خاص حصے کے ترجمے اور اقتباسات ناظرین معارف کی ضیافت کے لئے پیش کرین گے، تاکہ اُن کو اس کتاب کی نوعیت اور خوبی کا صحیح اندازہ ہو سکے، اور اگر کسی صاحب قلم نے اردو مین اس کا ترجمہ کر دیا، تو اردو کے ذخیرہ مین ایک مایۂ ناز کتاب کا اضافہ ہو جائے گا،

مقدمۂ رقعات عالمگیر

مرتبہ

(پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی)

اس مین رقعات پر مختلف حیثیتون سے تبصرہ کیا گیا ہے، جس سے اسلامی فن انشاء، اور شاہی مراسلات، کی تاریخ، اور ہندوستان کے صیغۂ انشاء کے اصول نہایت تفصیل سے معلوم ہوتے ہین، بالخصوص خود عالمگیر کے انشاء، اور اس کی تاریخ کے ماخذ، عالمگیر کی ولادت سے بہادر شاہ جنگ تک کے تمام واقعات، حالات پر خود ان خطوط و رقعات کی روشنی مین تنقیدی بحث کی گئی ہے،

قیمت :- صر

"منیجر"

مطبوعات جدیدہ

مولوی ذکاء اللہ دہلوی مترجمہ جناب ضیاء الدین احمد صاحب برنی تقطیع اوسط ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد سے، پتہ :- مترجم نمبر ۱۰۵ گیدول لیکھراج روڈ کراچی نمبر ۱ سے ملے گی،

مشہور پادری سی ایف اینڈریوز بیسوین صدی کے شروع مین عرصہ تک پرانے عربک کالج اور حال دہلی کالج مین استاد رہے تھے، وہ ایک سچے عیسائی اور بڑے شریف انگریز تھے، ہندوستان اور ہندوستانیون کے دوست تھے، اور اُن سے بڑا ربط وضبط رکھتے تھے، اس لئے اس دور کے دہلی کے تمام اکابر خصوصاً مولوی ذکاء اللہ صاحب مرحوم سے اُن کے بڑے مخلصانہ تعلقات تھے، مرحوم کی وفات کے بعد پادری صاحب نے انگریزی مین ان کی سوانح عمری ذکاء اللہ آف دہلی "لکھ کر حق دوستی ادا کیا تھا، اب اُن کے لائق شاگرد ضیاء الدین احمد صاحب برنی نے اردو مین اس کا ترجمہ کیا ہے، یہ کتاب اگرچہ مولوی ذکاء اللہ کی سوانح عمری ہے، مگر اس مین ان کے سوانح، سیرت و اخلاق، اور مذہبی و سیاسی خیالات وغیرہ ذاتی حالات کے علاوہ دلی مرحوم کی پرانی عظمت، تیموری دربار کی آخری جھلک، انیسوین صدی کی دلی کے سیاسی و معاشرتی حالات، دلی کالج کا قیام، جدید علوم کی اشاعت، اس کے اثرات، غدر کا ہنگامہ، اور اس کے نتائج مسلمانون کی تباہی و بربادی، امن وامان کا دور، مسلمانون کی بیداری، مدرسۃ العلوم علی گڈھ کی تحریک وغیرہ اس دور کی پوری سرگذشت آگئی ہے، اور کتاب دلی کی آخری بہار کا

نہایت دلچسپ مرقع بن گئی ہے، لائق مترجم نے ترجمہ نہایت سلیس اور شگفتہ کیا ہے، اور اصل کتاب کی ادبی خوبیون کو پوری طرح قائم رکھا ہے، مگر اس مین مولوی ذکاء اللہ صاحب کے علمی خدمات کا تذکرہ نہایت اجمالی ہے، اگر مترجم آخر مین اس کی تفصیل لکھ دیتے، اور اُن کی تصانیف کی فہرست دیدیتے، تو یہ کتاب اور زیادہ مفید اور مکمل ہو جاتی کتاب کے شروع مین مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کا دلچسپ مقدمہ ہے، جو انھون نے اسی زمانہ مین سی ایف اینڈریوز کی کتاب کے لئے لکھا تھا، جس کا انگریزی ترجمہ اس کتاب میں شائع ہوا تھا، اس مقدمہ مین مولوی صاحب مرحوم کی تحریر کی تمام خصوصیات موجود ہین، اور مترجم کے بیان کے مطابق یہ مولوی صاحب مرحوم کی آخری تحریر ہے، اس لئے تاریخی حیثیت رکھتی ہے، یہ کتاب اپنے دلچسپ تاریخی معلومات کے لحاظ سے اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے،

شرق اوسط مین کیا دیکھا؟ از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۲ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ، پتہ :- مکتبہ تعلیمات اسلام نمبر ۳، امین الدولہ پارک لکھنؤ،

آل انڈیا ریڈیو دہلی کی فرمایش پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے مشرق وسطیٰ کے حالات پر عربی مین چند تقریرین کی تھین، مذکورۂ بالا کتاب مشیر الحق صاحب بحریابادی کے قلم سے اس کا اردو ترجمہ ہے، لائق مقرر نے ڈیڑھ دو سال ہوئے تبلیغی سلسلہ مین حجاز، مصر، شام اور فلسطین کا سفر اور وہان کے حالات کا اپنی آنکھون سے مشاہدہ کیا تھا، اس لئے ان تقریرون مین انھون نے جو کچھ کہا ہے، وہ اُن کے ذاتی تجربات و مشاہدات ہین ریڈیائی تقریرون مین زیادہ تفصیل کی گنجایش نہین ہوتی، تاہم مقرر نے اختصار کے ساتھ تمام اہم اور قابل ذکر چیزون کا تذکرہ کر دیا ہے، جس سے ان ملکون کی دینی و اخلاقی اور علمی و تعلیمی حالت، علمی، و ادبی تحریکون مجلسی زندگی، اہل ملک کے خیالات و رجحانات اور عام اخلاق و عادات کا اجمالی علم اور اُن کے اکابر اور اہل علم سے اجمالی تعارف ہو جاتا ہے، یہ تقریرین مقرر کی صحت فکر، دقت نظر اور معلومات کے حسن انتخاب کا نمونہ ہین، اتنی مختصر کتاب مین مشرق وسطیٰ کے متعلق اتنے متنوع، مفید اور منتخب معلومات نہین مل سکتے، اور اس حیثیت سے یہ کتاب ہر تعلیم یافتہ

مسلمان کے مطالعہ کے لائق ہے، مترجم نے اصلی تقریروں کے حسن بیان کو بھی پوری طرح قائم رکھا ہے،

مطالعۂ غالب از جناب نواب جعفر علی خان اثر لکھنوی، تقطیع اوسط ضخامت ۱۱۲ صفحات،
کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ، پتہ:۔ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ،

ڈاکٹر عبدالرحمٰن مرحوم بجنوری کے مقدمۂ دیوان غالب کے بعد غالب پرستی اتنی بڑھ گئی تھی کہ اُن کے عیب بھی ہنر بن گئے تھے، اور اُن کے ہر خیال کو فلسفہ کا درجہ دیا جانے لگا تھا، مگر اب کچھ دنوں سے ناقدین کی نظر اُن کے عیوب پر بھی پڑنے لگی ہے، اور اس حیثیت سے اُن کے کلام کا جائزہ لیا جانے لگا ہے، غالب کی شاعرانہ عظمت میں کوئی کلام نہیں، انھوں نے اردو شاعری میں بڑی جدت و ندرت رفعت و بلندی اور وسعت و گہرائی پیدا کر دی، مگر اس کے باوجود ان کا کلام خامیوں سے پاک نہیں ہے خصوصاً ابتدائی دور کا کلام جب وہ صحیح راستہ پر نہیں لگے تھے، اور تھوڑی دور ہر راہرو کے ساتھ چلتے، اور بیدل کی تقلید کے چکر میں مبتلا تھے، اغلاق و ابہام اور تعقید و پیچیدگی کی چیستان ہے، مگر صحیح راستہ پر لگنے اور طرز و اسلوب کی پختگی کے بعد ان کا کلام اردو شاعری کا اعجاز بن گیا، اور اُن کے درمیانی خصوصاً آخری دور کا کلام سہل ممتنع ہے اور سحر حلال کا اثر رکھتا ہے، فاضل مصنف نے اسی نقطۂ نظر سے غالب کی نفسیات کا تجزیہ کیا ہے، اور ان کی شاعری پر اس کے اثرات، ابتدائی دور میں قدیم اساتذہ خصوصاً میر سے استفادہ، کلام کی خصوصیات اور اس کے محاسن و معائب دکھا کر اس کا صحیح درجہ متعین کیا ہے، اور اُن کے چالیس اشعار کی شرح کی ہے، اور اُن کی خوبیاں دکھائی ہیں، جس میں بیشتر دوسرے شارحین سے اختلاف ظاہر کیا ہے، اور آخر میں غالب کی غزلوں کا انتخاب ہے، یہ کتاب بھی مصنف کی دوسری کتابوں کی طرح انکی دیدہ وری اور نکتہ سنجی کا نمونہ ہے، اور انھوں نے اس جائزہ میں غالب کے ساتھ پورا انصاف برتا ہے، ان کی خامیوں کے ساتھ اُن کے کمالات کا بھی پوری فراخ دلی کے ساتھ اعتراف کیا ہے، مگر موضوع کی اہمیت کے لحاظ سے یہ کتاب تشنۂ بحث ہے، اور میر کے ساتھ مصنف کی مفرط عقیدت جا بجا نمایاں ہے،

تاریخ مملکتِ اسلام مؤلفہ جناب شوکت علی صاحب ایم اے لکچرار پنجاب یونیورسٹی و محمد اعظم صاحب لکچرار گارڈن کالج راولپنڈی و ڈاکٹر ریاض الاسلام صاحبان، تقطیع چھوٹی ضخامت ۶۰۵ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی قیمت تحریر نہیں، پتہ پبلشرز یونائٹڈ نمبر ۱۷۶ انارکلی لاہور،

اردو میں اب تاریخ اسلام پر اتنا وافر ذخیرہ فراہم ہو گیا ہے کہ اس کی مدد سے آسانی کے ساتھ مختصر اسلامی تاریخیں مرتب کی جا سکتی ہیں، مذکورۂ بالا کتاب بھی اسی قسم کا اختصار ہے، اس میں عہد رسالت سے لے کر معتصم باللہ عباسی تک اسلامی مملکت کی مختصر سیاسی تاریخ تحریر کی گئی ہے، ہر دور کے اجمالی علمی و تمدنی حالات بھی دیدیئے گئے ہیں، دار المصنفین کی تاریخ اسلام سے اس میں کافی مدد لی گئی ہے، مگر ایک یا دو مقاموں کے علاوہ اس کے بجائے اصل ماخذوں کا حوالہ دیا گیا ہے، چنانچہ تاریخ اسلام میں حوالوں کی جو بعض غلطیاں رہ گئی تھیں وہ اس میں بھی موجود ہیں، ان کا اندازہ دونوں کے تفصیلی مطالعہ سے ہو سکتا ہے، کسی کتاب سے اخذ و استفادہ میں کوئی عیب نہیں ہے، بشرطیکہ حوالہ دیدیا جائے، صرف دیباچہ میں اس کا ذکر کر دینا کافی تھا، مگر جس کتاب کی تالیف میں دو پروفیسروں اور ایک ڈاکٹر کی متحدہ کوششیں شریک رہی ہوں، اس میں کسی اردو کی کتاب کا حوالہ غالباً کسر شان تھا، بہرحال اصل مقصود تو افادہ ہے، وہ اس صورت میں بھی حاصل ہو جاتا ہے، یہ کتاب انٹرمیڈیٹ کے لئے لکھی گئی ہے، اور اس کے لئے کارآمد ہے،

امریکہ مترجمہ جناب سید محمد حسنین و سید ابو الخیر کشفی، تقطیع اوسط ضخامت ۲۷۲ صفحات، کاغذ، کتابت، و طباعت، بہتر، قیمت مجلد عا، پتہ:۔ فیروز سنز بک سیلر میکلوڈ روڈ کراچی، نمبر ۶۰ دی مال لاہور نمبر ۳۵، دی مال پشاور،

یہ کتاب مشہور امریکی صاحب قلم اسٹیفن ونسنٹ بنیٹ کی تصنیف "امریکہ" کا ترجمہ ہے، اس میں سترھویں صدی کی ابتدا سے لے کر جب سے یوروپین قوموں نے امریکہ کو نو آبادی بنانا شروع کیا تھا موجودہ دور تک اس کی تاریخ کو اس طرح تحریر کیا گیا ہے، جس سے اس نئی دنیا، اور نئی قوم کی سیاسی، تمدنی،

اور عمرانی تاریخ اور اس کی ترقی کا پورا مرقع سامنے آجاتا ہے، انداز تحریر فلسفیانہ، مگر اتنا شگفتہ اور ادیبانہ ہے کہ تاریخ میں افسانہ کی دلکشی پیدا ہوگئی ہے، اور لائق مترجمین نے اصل کتاب کی ادبی خوبیوں کو اس طرح اردو کے قالب میں ڈھال دیا ہے کہ ترجمہ پر تصنیف کا گمان ہوتا ہے، اس کتاب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس سے امریکہ کی تاریخ کے ساتھ امریکن قوم کی وہ قوتِ عمل، جگر کاوی، اور زندگی کی تاب و توان پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے، جس نے ایک نوزائیدہ ملک و قوم کو جس کی عمر چند صدیوں سے زیادہ نہیں ہے دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوم اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک بنا دیا، مصنف نے امریکہ کے آزادی اور مساوات کے تصورات کو بھی نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے، مگر کم سے کم اس زمانہ میں اس کا عمل اس کے بالکل خلاف ہے، اور اس نے اپنے عالمی اقتدار کے لئے دنیا کے امن کو خطرہ میں ڈال دیا ہے، اس کتاب کے ترجمہ سے اردو میں مختصر اور فلسفیانہ تاریخ نویسی کا ایک اچھا نمونہ قائم ہوگیا،

نجات مؤلفہ لوئی فشر تقطیع چھوٹی ضخامت ۷۰ صفحات کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ غیر مجلد

پتہ:- فیروز سنز بک سیلرز بندر روڈ کراچی و نمبر ۶۰ دی مال روڈ لاہور و نمبر ۳۵ دی مال پشاور،

یہ کتاب بھی ایک امریکن مصنف لوئی فشر کی کتاب "تھرٹین ہو فلیڈ" کا اردو ترجمہ ہے، سوویٹ یونین کے حامی روس کو آزادی و مساوات اور معاشی اطمینان و آسودہ حالی کی جنت بتلاتے ہیں، اور اس کے مخالفین اس کو جبر و استبداد اور قید و بند کی جہنم کہتے ہیں، لوئی فشر آخر الذکر طبقہ سے تعلق رکھتا ہے، اسی نقطۂ نظر سے اس نے یہ کتاب لکھی ہے، اس میں روس کے مختلف طبقوں کے تیرہ باشندوں کی جن میں بعض کمیونسٹ بھی ہیں، آپ بیتی ہے جنھیں روسی حکومت کے جبر و استبداد اور سخت گیریوں سے تنگ آکر وطن چھوڑنا پڑا، اس کتاب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ روسیوں کی زندگی سیاسی حیثیت سے کس قدر پابند اور معاشی حیثیت سے کس قدر غیر مطمئن ہے، اور اس کے مقابلہ میں غلام ملکوں میں خیالات و عمل کی زیادہ آزادی ہے، مگر لوئی فشر امریکن اور سوویٹ یونین کا بڑا مخالف ہے، اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان واقعات میں کہاں تک صداقت ہے،

"م"

جلد ۷۱ ماہ رجب المرجب ۱۳۷۲ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۵۳ء عدد ۴

مضامین

مقالات

تلخیص و تبصرہ

ادبیات

باب التقریظ والانتقاد